# صبر کے قرآنی مفاہیم: سورۃ الفاتحہ کے تناظر میں سورۃ البقرہ کا توقیفی مطالعہ

# Quranic Concepts of Patience: A Critical Study of Surah Al-Baqarah in the Context of Surah Al-Fatiha

Mian Inaam ur Rehman
Email:Inaam1970@gmail.com

## Abstract

The interrelationship of various subjects mentioned in the Holy Qur'an plays a vital role in interpreting Islamic teachings. Surah Al-Fatiha is important in understanding and interpreting the Holy Quran. The subjects indicated in Surah Al-Fatiha show that it summarizes the entire Qur'anic message. From this point of view, it can be said that the Quran as a whole contains the details of the facts mentioned in Surah Al-Fatiha. In this regard, it is necessary to understand the various surahs of the Holy Qur'an in the light of Surah Al-Fatiha regarding various topics. This analytical approach also makes the connection between different surahs clear. This article guides us toward understanding the themes of Surah Al-Baqarah regarding the concept of patience in the context of Surah Al-Fatiha.

**Keywords:** Holy Qur'an, Interrelationship ،Islamic teachings, Patience, Surah Al-Baqarah, Surah Al-Fatiha

قرآن مجید کے زندہ و جاوید معجزہ ہونے کی شہادت پچھلے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس کی مستند تاریخ دے رہی ہے۔ ان برسوں میں دنیا کئی طرح کے نشیب و فراز سے گزری، انسانی زندگی مختلف النوع تبدیلیوں سے ہمکنار ہوئی۔ لیکن قرآن مجید حرف حرف نہ صرف محفوظ رہا بلکہ ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾[1] کے مصداق اپنے امکانات کی روشنیاں بکھیرتا رہا۔ اگرچہ انسانی بصارت و ظاہری آنکھ "یوم" کو ہر روز ایک سا دیکھتی ہے اور کوئی ظاہر بین قرآنی آیات کو بھی ہر زمان و مکان میں ایک سا خیال کرتا ہے تو یہ نہ یوم اور نہ آیات کی کم مائیگی و تنگ دامنی ہے بلکہ حد سے بڑھی ہوئی کوتاہ نظری ہے۔ "یوم" کے شانِ نو کی تفہیم کی دلیل اور اس تک رسائی تکوینی علوم کے ذریعے ہوتی رہی

[1] الرحمن: 29

ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس عالمِ اسباب میں بقاو حیات کا سارا مدار ہی شانِ نو کے مسلسل ظہور میں ہے اور یہ ظہور کائناتی تحرک کا پروردہ ہے۔

قرآن مجید پر غور کیجیے، اس کے کلامِ الہیٰ ہونے کے دعوی اور تقریباً ڈیڑھ ہزار برس کی داعی تاریخ کو دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ ان دو (دعویٰ کلامِ الہیٰ—داعی تاریخ) میں یک گونہ تضاد موجود ہے جس کی وجہ سے کلامی مباحث کے ایک طومار نے جنم لیا ہے۔ اس اجمال کی مختصر شرح یہ ہے کہ اگر قرآن مجید کلامِ الہیٰ ہے انسان سے ماورا ہے تو ایک عام انسان کس طرح اسے سمجھنے کی پوزیشن لے کر اس کا داعی بن سکتا ہے؟ کیا انسان میں ورائیت تک رسائی کی استعداد موجود ہے؟ اگر موجود ہے تو اس کی دلیل کیا ہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ کسی عام انسان میں یہ استعداد "بقدرِ ضرورت" موجود ہے۔ مثال کے طور پر حیوانات کو دیکھیے کہ بنیادی طور پر جبلی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن اس جبلت کے باوجود انسان انہیں سدھانے اور پالتو بنانے کے قابل ہوتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا عنصر شے یا عامل ہے جو انسان اور حیوان کے درمیان "تعلق" کا باعث بنتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جبلت کا پروردہ ہونے کے باوجود حیوان "بقدرِ ضرورت" انسانی عقل کی مطابقت میں آنے کی استعداد کا حامل ہوتا ہے۔ اگر اس میں یہ استعداد نہ ہو تو وہ کبھی بھی انسان کے اشاروں پر اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا اور کرتب دکھانا جیسے افعال سرانجام نہ دے سکے، انسان چاہے کتنا سکھاتا رہے۔ بالکل اسی طرح انسان بھی عقل کے زندان کا اسیر ہونے کے باوجود کلامِ الہیٰ (وحی) کی مخاطبت کی استعداد "بقدرِ ضرورت" اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس لیے انسان کے لیے خدا کے اشاروں پر چلنا زندگی بسر کرنا بہت دشوار نہیں رہتا۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کلامِ الہیٰ کے داعی ہونے کی پوزیشن لینے کی اہلیت سے ہمکنار ہے۔

پھر یہ کہ جیسے کسی حیوان کے لیے "بقدرِ ضرورت" سے تجاوز کر کے بھی، انسانی سطح تک اوپر اٹھنے کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے، اسی طرح انسان کے لیے بھی بقدرِ ضرورت وحی کی مطابقت میں آنے سے بہت بڑھ کر بھی، وحی کی اکمل کیفیت تک آنے کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ اس لیے کلامِ الہیٰ کی حیثیت بھی حقیقت میں انسان کے لیے ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾[2] کی سی ہو جاتی ہے کہ یوم میں رہتے ہوئے وحی کی مخاطبت کا اہل ہونے کے ناطے "شانِ نو" کی لپک پر لپکتا چلا جائے۔

---

[2] الرحمن: 29

قرآن مجید کی تفہیم کے ضمن میں راقم الحروف "شانِ نو" کی چند رنگا رنگ جہتوں سے قلب و نظر کی ضیافت کا سامان کرتا آیا ہے۔ آنے والی سطور میں ان نیرنگیوں کی فقط ایک جھلک سی دکھانے کی ہمت ہو گی جس سے بہر حال یہ اندازہ ہو گا کہ ایک چھوٹا سا جگنو کس طرح تیرہ و تار اطراف وجوانب میں روشنی کی جھلمل جھلمل بکھیر دیتا ہے۔

سورۃ البقرہ قرآن مجید کی طویل ترین اور دوسری سورت ہے۔ اس کے مضامین کا احصانا ممکن ہے چہ جائے کہ پورے قرآن مجید کو مکمل سمجھنے کا باطل دعوی کیا جائے۔ سورۃ البقرہ پر اگرچہ مختلف انداز میں کام ہوا ہے لیکن شاید اس رُخ پر کسی نے پہلے قلم نہ اٹھایا ہو کہ قرآن مجید کے "اقداری نظام" کی دریافت قرآن مجید کے ذریعے کرنے کی غرض سے، مختلف قرآنی الفاظ و تراکیب کا توقیفی مطالعہ کرتے ہوئے ہر قدر کے معانی و مفاہیم کا تعیین کیا جائے۔ مثلاً صبر کو لیجیے۔ ہمارے مذہبی و ادبی لٹریچر میں اس کے معنی عموماً قرآنی منشا سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ غیر فعالیت، پست ہمتی اور تجمد جیسے پہلوؤں کو صبر کا نام دے دیا گیا ہے۔ (یہ معانی بھی درست سمجھے جاسکتے ہیں اگر قرآنی شواہد سے مدلل و مستشہد ہوں)۔ واقعہ یہ ہے کہ تحریر و تقریر کے لیے یا موقع و محل کی مناسبت سے آیاتِ کریمہ سے استدلال کر کے، ان کے قرآنی منشا کے بالکل برعکس بھی معانی اخذ کیے جاسکتے ہیں کیے جاتے رہے ہیں کیے جا رہے ہیں اور کیے جاتے رہیں گے۔

ہماری نظر میں کسی قرآنی تصور قدر یا اس کی کسی ترکیب کے معانی تک کماحقہٗ رسائی کا ایک بڑا موثر ذریعہ اس کا "بقدرِ استعداد" ایسا توقیفی مطالعہ ہو سکتا ہے جس میں کسی تصور و قدر یا ترکیب کے منزل در منزل مرتب ہوتے نشو و نما پاتے پھیلتے بڑھتے (مخلوطی- مخروطی) معانی دریافت ہوتے رہیں۔ اس مضمون میں ہم صرف سورۃ البقرہ کے توقیفی مطالعے کی روشنی میں "صبر" کے قرآنی مفاہیم جاننے کی کوشش کریں گے۔

## پہلی جہت

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾[3] (صرف اور صرف تجھ ہی سے ہم استعانت چاہتے ہیں)

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ (صرف اور صرف تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) کے بعد ﴿إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (صرف اور صرف تجھ سے ہی ہم استعانت چاہتے ہیں) کے بیان سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کا صرف اللہ ہی کی عبادت

[3] الفاتحة: 5

کرنا عبدیت کی تکمیل نہیں اور نہ معبودیت کی (بالحق کامیاب کوشش)، البتہ انسان کا صرف اور صرف اسی سے استعانت طلب کرنا، تکمیل سے پہلے عابد و معبود کے مطلوب و مقصود تعلق کو گوندھتا ہوا، تکمیل کی طرف لے جانے والا عمل ضرور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ استعانت کا بہت گہرا واسطہ عابد و معبود کے تعلق کی درستی و تکمیل سے ہے۔ استعانت حقیقت میں ، صرف اللہ ہی کو پوجنے کے ساتھ بہت مضبوطی سے جڑی ہوئی ہے۔ یوں سمجھیے کہ عبادت اگر جسم ہے تو طلبِ استعانت اس کی روح ہے، عبادت ظاہر ہے اور اعانت خواہی اس کا باطن ہے۔ صرف اور صرف اس (اللہ) کی بندگی صرف اور صرف اس کی مدد کے ساتھ (ایک طرح سے) مشروط ہے۔

عبد و معبود کے تعلق و رابطہ (عبادت) میں در آنے والی کسی بھی کمی کو زائل کرنے یا کسی متوقع نقص سے بچانے والی اس استعانت کی اپنی حقیقت کیا ہے؟ اس کا پہلا جواب سورۃ البقرہ کی آیت 45 ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ﴾ ("اور صبر اور صلاۃ سے استعانت لو اور بے شک یہ گراں ہے مگر ان پر (نہیں) جو عجز کرنے والے ﴿الْخَاشِعِينَ﴾ ہیں")

اس آیت کے مطابق عبدیت کی صحیح پہچان اور معبودیت کے کماحقہٗ عرفان کو درکار "استعانت" صبر و صلاۃ پر مشتمل ہے، جس سے مستفید ہونا ہے تو مشکل، لیکن عاجزین ﴿الْخَاشِعِينَ﴾ پر یہ ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ یعنی صرف اور صرف اس (اللہ) کی بندگی (کا حق ادا کرنے) کے لیے صرف اور صرف اس سے استعانت کا (دوسرا) نام صبر و صلاۃ ہے۔ لیکن خیال رہے کہ ان دو اجزا کی حامل استعانت چوں کہ بندگی میں کہیں موجود نقص کی درستی کے لیے ہے اس لیے نفس کو ضرور بالضرور گراں گزرتی ہے لیکن عاجزوں پر یہ قطعاً گراں بار نہیں ہوتی۔

اس آیت سے یہ تو معلوم ہو رہا ہے کہ استعانت ہے کیا اور یہ بھی کہ یہ بھاری ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا محل کیا ہے؟ عبدیت و بندگی میں وہ خامی کیا ہے کہاں ہے کیسی ہے؟ یہ جاننے کے لیے اس سے پچھلی آیت 44 کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ ("کیا حکم کرتے ہو انسانوں کو 'البر' کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو اور تم تو تلاوت کرتے رہتے ہو الکتاب کی، کیا تم سوچتے سمجھتے نہیں ہو؟")

سورۃ الفاتحہ کے الفاظ ﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کو مد نظر رکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ استعانت کا پہلا قرآنی محل پہلا قرآنی موقع جب انسان کو اس کی ضرورت پیش آتی ہے، الکتاب کی تلاوت کرتے رہنے کے باوجود خود کو بھولتے ہوئے دوسروں کو "البر" کا حکم دینا ہے۔ یعنی خود فراموشی خود کو بھولنا عابد و معبود کے مطلوب تعلق (عبادت) کی راہ میں پہلی رکاوٹ ہے۔ اس کا ایک سامنے کا مطلب یہ ہوا کہ حقیقت میں (بندگی کا حق ادا کرنے کے لیے) استعانت کی ضرورت انسان کو سب سے پہلے اپنے مقابل پیش آتی ہے نہ کہ دوسرے (انسانوں) کے مقابل۔ (وجودی فلسفے کی غالب جہت "جہنم، دوسرے لوگ ہیں" کا مکمل رد) اس میں نہایت قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس (استعانت) کی کس قسم کے انسان کو ضرورت پیش آتی ہے؟ کیا وہ جو خدا سے مکمل لا تعلق ہے؟ دہریہ ہے؟ نہیں، ایسے انسان کو ہرگز نہیں، بلکہ ایسے انسان کو جو نہ صرف مذہبی ہے خدا پر ایمان رکھتا ہے بلکہ اس کی معمول کی زندگی مذہبی طرز کی ہے تبھی تو وہ "الکتاب" کی تلاوت بھی کرتا رہتا ہے۔ اور پھر دیکھیے کہ (ضرورتِ استعانت کا یہ پہلا قرآنی مقام) براہ راست خدا کی معبودیت (میں کمی) سے متعلق ہونے کے بجائے انسانوں کے باہمی تعامل کی ایک بنیادی خامی "خود ستائی" کو آشکارا کرتا ہے۔ یعنی انسانی باہمی تعلقات میں، انسانوں کی خود فراموشی کو، خدا سے تعلق میں خامی گردانا گیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ معبودیت، شخصی نہیں معاشرتی ہے۔ انسانوں کے درست باہمی تعامل کی آئینہ دار ہے۔

چوں کہ انسان / نسیان کا مادہ ایک ہے اس لیے یہاں ایک لطیف نکتہ مضمر ہے کہ دوسروں کو "البر" کا حکم دینے والے اپنے میں موجود نسیان کی حالت کو، دوسروں پر برابر و متوازی ملحوظ نہیں رکھتے کہ اُنہیں تحکمانہ انداز میں 'البر' کا حکم دیے جاتے ہیں۔ اگر بر کا حکم دینے والے دوسروں کی انسانی (نسیانی) حالت کا اپنے پر قیاس کر کے کچھ خیال کریں تو 'البر' کی صحیح ترویج بہتر طور پر کر پائیں گے۔ اپنے اس نوع کے نسیان پر ایمان والے انسان کیسے قابو پا سکتے ہیں کہ دوسروں کو اپنے پر قیاس کر کے تحکم سے گریز کریں، اس کا جواب آیت 45 ہے[4]۔

[4] ﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ﴾ البقرة: 45

﴿وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴾[5] میں ایک اور نکتہ پوشیدہ ہے کہ الکتاب کی تلاوت کرنے والے جس 'التباس' کا شکار رہتے ہیں وہ اپنے تئیں "البر" پر مکمل کاربند ہونے کا زعم ہے۔ انہیں پختہ یقین ہوتا ہے کہ وہ (دوسروں کے مقابلے میں کہیں بہتر طور پر) بندگی کا پورا پورا حق ادا کر رہے ہیں۔ کیوں کہ آیت 43[6] کے حکم:

"اور قائم کرو صلاۃ اور دیا کرو زکوۃ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ"

کے مطابق وہ نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں زکوۃ دے رہے ہوتے ہیں نیز اجتماعی نظامِ اطاعت کا بھی حصہ ہوتے ہیں۔ آیت 43 کے بیان ﴿وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴾ میں ﴿مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾ پر غور کیجیے۔ ان کی طرح ان کی اتباع میں (وغیرہ) کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ ان کی معیت ان کے ساتھ کا پورا پورا لحاظ رکھنے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہ بندگی کی (شخصی نہیں) اجتماعی-ظاہری-خارجی جہت ہے کہ راکعین کے جلو میں رہنا ہے، کہیں آگے پیچھے دائیں بائیں نہیں ہونا بلکہ راکعین کی معیت و مطابقت اختیار کرنی ہے۔ پھر اگلی آیت ﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾[7] "کا بیان نشاندہی کرتا ہے کہ راکعین کی مطابقت میں رہنے کی (بندگی کی اجتماعی جہت) ڈسٹرب ہوئی ہے (کہ راکعین کی معیت اختیار کرنے کے بجائے ان سے آگے آگے نکلنے کی کوشش ہو رہی ہے) اور اس طرزِ عمل کی وجہ بندگی کی شخصی (داخلی) جہت کا (قدرے) منتشر ہونا ہے۔ اسی وجہ سے تلاوتِ کتاب بھی صحیح رُخ پر نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ (ایمان رکھنے کے باوجود بے خبری کے عالم میں) نفسی تمناؤں کے جلو میں الکتاب (قرآن مجید) کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ قرآن مجید (آیت 45) کے مطابق اس مقام پر انہیں الوہی اعانت کی ضرورت پیش آتی ہے تاکہ شخصی-داخلی-باطنی بندگی کا نقص و انتشار ختم ہو اور وہ راکعین کی مطابقت میں اجتماعی-ظاہری-خارجی بندگی اختیار کر سکیں۔

خیال رہے کہ آیت 44 میں ﴿وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ﴾ کا بیان قرآن مجید کے الفاظ سے زیادہ اس کے لب و لہجے کی نمائندگی کر رہا ہے۔ جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا تو ہمارے نبی کریم ﷺ اسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سنایا کرتے تھے۔ تو کیا قرآن مجید کی ہر آیت نبی کریم ﷺ ایک ہی انداز میں بیان فرما دیتے تھے؟ کیسے ممکن ہے کہ نبی

---

5 البقرة: 44

6 ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴾ البقرة: 43

7 البقرة: 44

آخر الزمان ﷺ آیت کے مضامین وغیرہ کالحاظ نہ رکھتے ہوں، تخویف و تشویق اور بشارت و انذار (وغیرہ) کی حامل آیات مبارکہ کو ایک ہی طرز پر سنا دیتے ہوں؟ اگر ایسا ہونا (بالفرض) مقصود و مطلوب ہوتا تو تمام قرآن ایک ہی وقت میں لکھا لکھایا نازل ہو جاتا اور لوگ اس سے (آج کل کی طرز پر) تلاوتِ محض کی صورت میں استفادہ کرتے رہتے۔ (جیسا کہ زیرِ نظر آیت کے بین السطور، تلاوتِ کتاب کرنے والے یہی غلطی کر رہے ہیں) حقیقت یہ ہے کہ بشر پر قرآن مجید کے بتدریج نزول کا ایک بڑا مقصد ہی اس کے الفاظ کے بجائے لہجے (اور لہجے میں مستور و ہویدا تاثیر) کو دیگر انسانوں تک منتقل کرنا تھا۔ حدیثِ رسول پاک ﷺ کا بڑا حصہ بھی حقیقت میں قرآنی الفاظ کے لہجے کے انتقال و ابلاغ پر مشتمل ہے۔

اب ذرا ﴿وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ﴾ پر غور کیجیے۔ اگر لہجے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے محض الفاظ لیے جائیں تو بہت عجیب صورتِ حال سے پالا پڑتا ہے۔ لیکن لہجہ بتا رہا ہے کہ اس بیان میں حیرانی و افسوس، تنبیہ و ترہیب اور فکر مندی و طنز کی قبیل کے تمام قرائن پائے جا رہے ہیں۔ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو۔۔۔۔۔۔ یہ کس طرح تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔۔۔۔۔ تمہیں تلاوتِ کتاب کا دعوی تو بہت ہے لیکن۔۔۔۔۔ اور تم کتاب کی تلاوت (اپنی تمناوں آرزوؤں کے نفسی تناظر میں) کرتے ہو، اسی لیے تو دوسروں کا بر کا حکم دیتے ہو۔۔۔۔۔ (خیال رہے بعض اہلِ علم کے نزدیک البقرۃ آیت 78 ﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾ میں ﴿أَمَانِيَّ﴾ تلاوت کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے: "اور ان میں سے کچھ اُمی ہیں جو کتاب میں سے کچھ نہیں جانتے سوائے پڑھنے ﴿إِلَّا أَمَانِيَّ﴾ (تلاوت کرنے) کے اور وہ محض گمان میں پڑے رہتے ہیں") لہذا آیت 44 میں تلاوتِ کتاب سے، صرف لفظ پڑھ لینا، مفہوم و مقصود نہ سمجھنا، جھوٹی آرزوؤں کو مقدم رکھنا، جیسے معانی منقح ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کلامِ الہی کی تلاوت کا حق جیسا کہ اسے تلاوت (لہجے کے مکمل احصا کے ساتھ) کیا جانا چاہیے ادا نہ ہو تو انسان مغالطے کا شکار ہو کر دوسروں کو "البر" کا حکم دینے لگتا ہے اور خود کو بھول بیٹھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تلاوتِ کتاب کے عاملین کو صحیح رُخ پر آنے کی ترغیب دی جا رہی ہے ہمت بندھائی جا رہی ہے کہ صبر و صلاۃ سے اعانت لے لو۔ قرآن مجید کے مطابق استعانت بالکلیہ صبر و صلاۃ ہے۔

غور کیجیے کہ آیت 43 میں اقامتِ صلاۃ کا بیان ہے اور آیت 45 میں استعانت کے ضمن میں صلاۃ کا دوبارہ ذکر آیا ہے۔ یہ ذکر تاکیدی نہیں ہے بلکہ مذکورہ بحث کے تناظر میں صراحت کر رہا ہے کہ آیت 43 کے (مطابق) عابدین و

معبود کا جو عبادتی تعلق قائم ہوا ہے، عابدین (درحقیقت) اس کا پورا پورا حق ادا نہیں کر رہے، کیوں کہ ان کے ہاں (بندگی کا تکمیلی جز) اعانت خواہی (عبادت کی روح) مفقود ہے، جس کی وجہ سے وہ بھُولے بیٹھے ہیں خود فراموشی کے عالم میں ہیں۔ لہٰذا عبادت (تعلق) کی تصحیح و درستی کے لیے اعانت خواہی کی حامل صلاۃ کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔

آیت 44 کے مکمل مفہوم کو ذہن میں رکھتے ہوئے آیت 45 پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ گراں ہونے کا بیان صلاۃ کے لیے نہیں بلکہ ایسی استعانت کے لیے ہے جس کا جواز جس کی بنیاد (بندگی کی اجتماعی جہت ﴿وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾[8] تج کر ﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ﴾[9] جیسا رویہ اختیار کر کے) نفسی تمناوں اور خود پارسائی کے زعم میں تلاوتِ کتاب کرتے جانا ہے۔ اس لیے صبر وصلاۃ کی حامل یہ (استعانت) اگرچہ بھاری تو ہے گراں بھی ہے لیکن خاشعین کے لیے نہیں۔ اب یہ ﴿الْخَاشِعِينَ﴾ کون ہیں اس کا جواب آیت 46 میں ہے کہ "جنہیں ظن ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور یہ کہ انہیں اُس کی طرف رجوع کرنا ہے"[10]

اپنے پروردگار اپنے پالنے والے اپنے رب سے ملاقات کا جنہیں ظن ہو خیال ہو، وہ عاجز ہیں۔ ایسوں پر استعانت بالکل بھی گراں نہیں ہے۔ غور کیجیے کہ (یقینی) تلاوت کرنے والوں کو تو کہا گیا کہ کیا تم سوچتے سمجھتے نہیں ہو؟ جب کہ اپنے رب سے ملاقات کا محض ظن رکھنے والوں کو (آرزووں کے نفسی تناظر میں کی گئی) تلاوتِ کتاب اور اس کے غیر مطلوب نتائج (دوسروں کو نصیحت خود میاں فصیحت) سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مطلوب اعانت کے گراں نہ ہونے کا بیان دے کر مطمئن کیا گیا ہے۔ یعنی رب سے ملاقات کا ظن، استعانت (صبر وصلاۃ پر مشتمل) کی جڑ ہے۔ یہ ہے تو تلاوتِ کتاب درست ہو گی اور بندگی کا حق ادا ہو گا، یعنی انسان دوسروں کو 'البر' کا حکم دیتے وقت (شخصی-داخلی -باطنی بندگی کی تصحیح کی وجہ سے) خود اپنے کو دھیان میں رکھے گا جس کے نتیجے میں (اجتماعی-ظاہری-خارجی بندگی میں) دوسروں کی معیت اختیار کرے گا، ان سے دائیں بائیں آگے پیچھے نہیں نکلے گا۔

---

8 البقرة: 43

9 البقرة: 44

10 ﴿الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ البقرة: 46

(خیال رہے کہ ﴿وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴾[11] اور ﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴾[12] میں بھی گہری داخلی مناسبت موجود ہے۔ اول الذکر صورت و جسم ہے اور آخر الذکر اس کی روح۔ ایک ظاہر ہے تو دوسرا اس کا باطن)

اب ذرا ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾[13] مد نظر رکھتے ہوئے آیت 46 ﴿الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ میں ﴿يَظُنُّونَ﴾ اور ﴿رَبِّهِمْ﴾ پر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی پہلی سورت میں سب سے پہلے اپنی جس صفت کو بہت پر شکوہ انداز میں بیان کیا ہے وہ صفت ربوبیت ہے۔ ربوبیت میں افزائشِ حیات اور بقائے حیات کے جو رموز و مفاہیم پوشیدہ ہیں، ان کے تناظر میں "رب سے ظن" خوش عقیدگی کی انتہاؤں کو چھو لیتا ہے کہ ربوبیت کے مظاہر تو ہر سُو بکھرے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہاں رب سے ملاقات ﴿مُلَاقُو﴾ سپاٹ ملاقات نہیں رہتی، بلکہ تشنہ آرزوؤں اور پُر حسرت تمناؤں کی تشفی و تسکین کی حامل عطر آگیں مواصلت بن جاتی ہے۔ پھر دیکھیے ذرا کہ، ﴿مُلَاقُو﴾ اور ﴿رَبِّهِمْ﴾ میں کتنا گہرا ملاطفت سے پُر اور ترحم سے مملُو داخلی تعلق ہے۔ ملاقات ﴿مُلَاقُو﴾ بہت ذاتی اور شخصی پہلو لیے ہوئے ہے جس کی تنقیح ﴿رَبِّهِمْ﴾ سے ہو جاتی ہے۔ رب السموات والارض نہیں کہا گیا، ان ربکم نہیں کہا گیا، یا پھر کسی طور ھم نہیں لایا گیا، بلکہ ھم کے اظہاریے سے وہ بھی صفتِ ربوبیت کے ساتھ، بہت ہی قریبی تعلق جس میں کوئی واسطہ نہیں، من و تُو کی کسی بھی نوع کی مغائرت کو پاٹتی ہوئی، کائنات (عالمین) سے بے نیاز مجسم حضوری، یہی تو ﴿مُلَاقُو رَبِّهِمْ﴾ کے ایسے تلازمات ہیں اگر دھیان میں رہیں تو ﴿يَظُنُّونَ﴾ مزید جگمگا اٹھتا ہے۔

پس ہم اخذ کر سکتے ہیں کہ سورۃ البقرہ کی آیات 43، 44، 45، اور 46 کے مطابق ایمان والے، طلبِ استعانت سے احتراز کے باعث بندگی کا حق ادا نہیں کر پاتے، لیکن جیسی تیسی بندگی کے زعم میں (خود ستائی و خود فراموشی کے عالم میں) خود پارسائی کا شکار ہو کر دوسروں کو نیکی کا حکم دینے لگتے ہیں حالاں کہ الکتاب کی تلاوت بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں آیتِ اعانت (صبر و صلاۃ) کے ذریعے ان کی استعانت کی جاتی ہے اور ساتھ آگاہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ

---

11 البقرة: 43

12 البقرة: 45

13 الفاتحة: 2

اعانت بھاری ہے لیکن عاجزوں کے لیے نہیں، اور عاجز کون ہیں وہ جنہیں اپنے رب سے ملاقات کا ظن ہے۔﴿وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾،رب کی طرف پُر شوق لوٹنے کا تاکیدی بیان ہے۔

یہاں ان آیات کی تفہیم کے آخر میں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ بندگی میں کمی یا نقص کا شکار ہونے والے نیز تمناؤں کے نفسی تناظر میں تلاوتِ کتاب کرنے والے، استعانت کے لیے کیسے لپک سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بہر حال ایمان والے ہیں۔ ایمان والوں کی بھی بعض صلاحیتیں خوابیدہ اور دبی رہ جاتی ہیں، صرف یاد دلانے سے ان میں بیداری امڈ آتی ہے۔ خود ستائی و خود فراموشی پسپا ہو جاتی ہے اور خود تسخیری فتح مند۔ انہیں اپنے رب سے ملاقات یاد دلائی گئی ہے اور پھر تاکیدی یاد دلائی گئی ہے جس کا استحضار نہ ہونے کی وجہ سے ان کا دھیان دوسروں کو 'البر' کا حکم دینے پر لگ جاتا ہے۔ یاددہانی انہیں خوابیدگی سے بیداری میں لے آتی ہے اور انہیں اپنی (آخرت کی) فکر لگ جاتی ہے۔ لیکن خیال رہے کہ یہ فکر ہیبت ناک نہیں، کیوں کہ قرآن مجید کا بیانیہ اور لب ولہجہ انتہائی محبت بھری ملاقات سے لبریز ہے (آخر کو وہ ایمان والے ہیں بس ذرا چوک گئے ہیں)۔ ان آیات میں شارع کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے رب سے ملاقات دھیان میں رکھنے سے خشوع پیدا ہوتا ہے جس سے استعانت آسان ہو جاتی ہے اور تلاوتِ کتاب درست رُخ اختیار کر کے مطلوب نتائج دینا شروع کر دیتی ہے۔ لہٰذا اللہ پر ایمان کافی نہیں اگر اس سے ملاقات (کسی طور) دھیان میں نہیں، اور پھر تلاوتِ کتاب کرتے چلے جانا بھی سود مند نہیں بلکہ الٹا نقصان دہ ہو جاتا ہے۔ اگر رب سے ملاقات کا کچھ خیال (ظن) ہے تو صبر وصلاۃ کی حامل استعانت انتہائی نافع اور موثر ثابت ہو گی۔

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ میں رب سے پُر کیف ملاقات مضمر ہے جو ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کی تکمیل کرتی ہے۔ بندگی کی یہی مکمل صورت آیاتِ زیرِ نظر کا مطلوب و مقصود ہے۔ یعنی سورۃ البقرہ میں صبر کی پہلی جہت کا تعلق (خود پارسائی کے زعم سے بچتے ہوئے) عبدیت کی تصحیح کے ذریعے (دوسرے انسانوں کی معیت میں رہتے ہوئے) معبود کے ساتھ تعلق کی تجدیدی تکمیل ہے۔ جس سے مسئلہ زیرِ بحث ختم ہو جائے گا۔ ان آیات میں مخاطب اگرچہ گروہ کو کیا گیا ہے لیکن مرادِ خطاب افراد ہیں۔ مسئلے کی نشاندہی میں افراد کو براہ راست ہِٹ کیا گیا ہے ﴿وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ﴾ لیکن حل کی طرف جاتے ہوئے (براہ راست ہِٹ کرنے کے بجائے) نہایت حکیمانہ اسلوب میں افراد کو ایک دوسرے کے مقابل لائے بغیر فریق بنائے بغیر، طلبِ استعانت کی غرض سے (ہر ہر فرد

کو) اپنے رب سے ملاقات کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ یعنی جو بھی معاملہ ہے اس کی درستی افراد کے باہمی تعامل یا ایک دوسرے سے متعلق کسی (سخت) حکم وغیرہ سے نہیں، بلکہ ان کے اپنے رب سے تعلق کی تجدیدی تکمیل کے ذریعے کی گئی ہے۔ یہ ایسا حل ہے جس میں فریقین میں کسی کی بھی سبکی رسوائی یا ہار جیت نہیں ہوتی۔ اس لیے ہم بے خطر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ قرآن مجید میں صبر کی پہلی جہت ایجابی متحرک اور ربوبیت سے لبریز ہے۔

## دوسری جہت

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يَامُوسَى لَنْ نَصْبِرَ عَلَى طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَى بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَا سَأَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾[14]

"اور جب تم نے کہا، اے موسیٰ! ہم سے ایک (ہی) کھانے پر صبر نہیں ہو سکتا، تو ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجیے کہ ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز (وغیرہ) جو نباتات زمین سے اگتی ہیں ہمارے لیے پیدا کر دے۔ انہوں نے کہا کہ بھلا عمدہ چیزیں چھوڑ کر ان کے بدلے ناقص چیزیں کیوں چاہتے ہو؟ (اگر یہی چیزیں مطلوب ہیں) تو کسی شہر میں جا اترو، وہاں جو مانگتے ہو مل جائے گا۔ اور آخر کار ذلت اور محتاجی ان سے چمٹا دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔ یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور (اس کے) نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے یہ اس لیے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے"

اس آیت میں بنی اسرائیل کے متضاد رویے کا بیان ہے کہ ایک طرف وہ صبر نہیں کر پا رہے (جو استعانت کا لازمہ ہے) اور دوسری طرف حضرت موسیٰؑ سے اپنے لیے دعا (استعانتِ الٰہی) کی فرمائش کر رہے ہیں۔ ان کا یہ تضاد معاملات کو اپنی تمناؤں آرزوؤں کے نفسی تناظر میں دیکھنے سے تشکیل پایا ہے۔ اس لیے جب حضرت موسیٰؑ فرماتے ہیں کہ بھلا عمدہ (خیر) چھوڑ کر اس کے بدلے ناقص (ادنی) کیوں چاہتے ہو؟ تو ان کی ایک مراد (غالباً) صبر چھوڑ کر (صبر کے بدلے میں) بے صبر ہو جانا ہے۔ یوں قرآن مجید کے اس مقام پر صبر کی پہلی سلبی جہت سامنے آتی

[14] البقرة: 61

ہے کہ انسان ربوبیت کی جاری صورت پر قانع نہ رہے تو خیر کے بدلے ادنی کا سزاوار ہو جاتا ہے۔ غور کیجیے کہ اس آیت میں ادنی کے مقابل اعلیٰ نہیں بلکہ خیر آیا ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوا کہ "خیر" ادنی ہو ہی نہیں سکتا، وہ اعلیٰ ہی اعلیٰ ہے، البتہ اس کے اعلیٰ ہونے کی "نوعیت" کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں جو انسان پر منکشف بھی ہو سکتے ہیں اور مستور بھی رہ سکتے ہیں۔ لہذا، قناعت جو کہ صبر کی ایک جہت ہے سراپا خیر ہے۔ یہیں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ بنی اسرائیل ربوبیت کی ایک جاری صورت پر (بشکل شکر) صبر کرتے ہوئے مزید کی تمنا کرتے دعا کرواتے تو اللہ رب العزت انہیں مزید سے ضرور نوازتے۔ اس لیے مسئلے کی جڑ "بے صبری" ہی معلوم ہوتی ہے، تبھی تو استعانت و دعا کا جواز بھی باقی نہیں رہا۔ انہیں مزید کیا نوازا جاتا کہ کم بختوں کو بے صبری کی وجہ سے طلبِ استعانت (دعا) کا سلیقہ تک نہ آیا۔ ذرا ﴿رَبِّهِمْ﴾ کے مقابل ﴿رَبَّكَ﴾ کا رکھا پھیکا بیان ملاحظہ کیجیے۔ ﴿رَبَّنَا﴾ جیسا کوئی اسلوب اختیار کرنے کے بجائے ﴿رَبَّكَ﴾ (موسیٰؑ کا رب) کا بیان دے کر (اپنے) رب سے مغائرت و اجنبیت کا بھرپور اظہار کر رہے ہیں کہ جیسے ان کا رب کی ربوبیت سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں۔ یہ ناشکری کی انتہا ہے۔ اس کے بجائے انہیں اپنی نفسی تمناوں آرزوؤں کا پورا پورا لحاظ ہے، ﴿فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا﴾ کے بیان میں ﴿لَنَا﴾ کی تکرار (ہمارے لیے ہمارے لیے) کا کیا ایک مطلب یہ نہیں؟

ترکاری ککڑی گیہوں مسور اور پیاز کے زمین کی پیداوار ہونے کے باوجود ان کے لیے "مصر" میں جا اترنے کا بیان ان کے بے موسمی یا غیر علاقائی (وغیرہ) ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ (بڑے) شہروں میں ایسی (بے موسمی وغیر علاقائی) اشیا عام طور پر دستیاب ہوتی ہیں۔ من و سلوی کے ساتھ ﴿كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾[15] اور ﴿فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا﴾[16] اور ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ﴾[17] کے بیانات صراحت کر رہے ہیں کہ زمین سے نکلی (مذکورہ) فصلیں (بھی) ہمیشہ طیبات میں شمار رہی ہیں۔ یہ بنی اسرائیل کی بے صبری و بے قناعتی تھی کہ وہ موجود دستیاب اشیا پر شکر ادا کرنے کے بجائے غیر علاقائی و بے موسمی اشیا کے شدت سے طلب گار ہو گئے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ انسانوں کو شکر گزار بن کر علاقائی موسمی اشیا پر قناعت کرنی چاہیے نہ کہ دنیا

---

15 البقرة: 57

16 البقرة: 58

17 البقرة: 60

بھر کے مختلف علاقوں کی بے موسمی (طیب) اشیا کو شہری طرز پر کھانے پینے کا رواج دینا چاہیے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کا بیان ﴿اهْبِطُوا مِصْرًا﴾ قابلِ غور ہے۔ قدیم دور میں بڑے شہر دریاوں کے کناروں یا ٹیلوں پر آباد ہوتے تھے۔ اگر یہاں ﴿اهْبِطُوا﴾ سے واقعاتی حوالہ مراد لیا جائے تو یہ کوئی دریائی شہر ہو گا اور ظاہر ہے نشیب (اترائی) کی سمت میں ہو گا ایسے ساحلی شہروں میں ہر نوع کی اشیا آتی جاتی رہتی ہیں۔ زمین پر ھبوطِ آدمؑ کے مماثل اس میں متاع حیات کا وافر سامان تو موجود ہو گا لیکن جنت کے سے مزے (خیر) نہیں ہوں گے (من و سلوی کے خیر ہونے کا بیان دھیان میں لایئے)۔ اگر یہ شہر کسی ٹیلے پر تھا تو ﴿اهْبِطُوا﴾ اور ﴿أَدْنَى﴾ کی داخلی مناسبت سے واضح ہوتا ہے کہ کسی بڑے شہر ﴿مِصْرًا﴾ میں جا اترنا خیر کے مقابلے میں ﴿أَدْنَى﴾ اور فروتر کو اختیار کرنا ہے۔

پھر آگے اسی آیت میں ذلت و مسکنت چمٹانے، اللہ کے (رب کے نہیں، اللہ کے) غضب میں گرفتار ہونے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ وہ اللہ کی آیات سے انکار (کفر) کرتے تھے۔ اللہ کی آیات ﴿بِآيَاتِ اللَّهِ﴾ کی ترکیب قرآن مجید میں سب سے پہلی بار اس مقام پر سامنے آئی ہے اور نفسِ مضمون کی روشنی میں شہادت دے رہی ہے کہ آیات اللہ سے مراد صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ مختلف النوع مظاہر بھی اس میں شمار ہوتے ہیں نیز یہ کہ کفر کے معنی ان مظاہر کو ان کے "واقعی فطری مقام" سے ہٹانے کے بھی ہیں۔ ربطِ کلام سے اس کا ایک مطلب یہ ہوا کہ بے موسمی غیر علاقائی زمینی پیداوار کی فرمائش بھی ایک اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں (آیات) کو ان کے صحیح فطری مقام و مرتبے سے ہٹانے کی کوشش ہے۔ استثنائی طور پر اگرچہ بڑے شہروں کی (محدود) حد تک اور ادنی درجے میں اس کی اجازت دی گئی ہے لیکن خیر یہی ہے کہ علاقائی موسمی دستیاب اشیا پر صبر کیا جائے۔ اسی خیر (صبر کے پھل) کی ترویج، مطلوب و مقصود بھی ہے تاکہ کرہ ارض کے نظام اور اس کی جزئیات کے آپسی رشتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو ان کے واقعی فطری مقام سے نہ ہٹایا جائے۔

آیت 61 کے آخری حصہ ﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ میں ﴿ذَلِكَ﴾ کا بیان بنی اسرائیل کی بے صبری کے سبب ان پر ذلت و مسکنت اور اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار ہونے کی چار وجوہات بیان کرتا ہے۔ کہ وہ حد پر نہ رہنے اور نافرمانی کی وجہ سے انبیا علیہم السلام کا قتل اور اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے، اسی لیے وہ ذلت و محتاجی اور اللہ کے غضب کا شکار ہوئے۔ جس کا ایک مظہر مذکورہ واقعہ میں ان کی (مذموم) بے صبری بھی ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوا کہ ان کی

بے صبری بظاہر جتنی معمولی دکھائی دیتی ہے حقیقت میں اتنی حقیر نہیں ہے۔ اس کے پیچھے ان کی اجتماعی نافرمانی اور اللہ کی نشانیوں کو ان کے واقعی فطری مقام سے ہٹانے کا عمومی طرزِ عمل موجود ہے۔

البقرہ کی زیرِ نظر آیت 61 اور اس کے مضمون سے منسلک آیات 57، 58، 59، 60 کا گہرا داخلی (موضوعاتی) ربط آیات 30، 35، 36، 37، 38، 39 سے بھی ہے جن میں قصہ آدم و ابلیس کا ابتدائیہ بیان ہوا ہے۔ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے ہم اتنا عرض کریں گے کہ اگرچہ آدمؑ عہد کی پاس داری نہ کر سکے اور بے صبرے ہوئے لیکن ان کے طرزِ عمل میں خود ستائی و استکبار کا ذرا بھی شائبہ نہیں ملتا اور وہ نہایت عاجزی و تشکر سے اپنے رب سے توبہ کے کلمات سیکھتے اور ادا کرتے ہیں، جب کہ بنی اسرائیل بتائے گئے کلمات کو ظالمانہ انداز میں بدل کر رکھ دیتے ہیں۔

بہر حال! ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ آیت 61 تک کے قرآنی بیان کے مطابق انسان کا بے صبر ہو جانا دُور از قیاس نہیں، کہ آدمؑ اس کا شکار ہوئے تھے۔ لیکن بے صبری کی وجہ اور اس کے بعد انسان کا طرزِ عمل طے کرتا ہے کہ اس کا رخ کس طرف ہے۔ بھول چوک (نسیان) کی جانب یا ارادتاً نافرمانی (عصیان و تعدی) کی طرف اس کا میلان ہے۔ آیت 61 کا مکمل بیانیہ درحقیقت، بے صبری کے حوالے سے گہری فکرمندی اور تشویش کا تلاطم بلا خیز ہے۔ یہ خدا کی خدائی کو للکارنے سے عبارت ہے، جس کا انجام ظاہر ہے اچھا نہیں ہو سکتا۔

## تیسری جہت

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾[18]

"اے ایمان والو! صبر اور صلاۃ سے استعانت لو، بے شک اللہ صابرین کے ساتھ ہے"

اس آیت سے پہلے قرآنی سیاق کا اس سے کوئی واضح تعلق نہیں۔ اس لیے یہ آیت ایک ایسا مستقل منفرد بیان ہے جس کی نوعیت بنیادی طور پر قدری-تربیتی اور کرداری معلوم ہوتی ہے۔ خطاب ایمان والوں سے ہے اور (ایمان کے باوجود) انہیں طلبِ استعانت کی تلقین کی گئی ہے۔ اس طرح ایمان ایسا بنیادی وصف قرار پاتا ہے کہ اس کے حاملین، حاملِ استعانت ہو سکتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ استعانت تو، عبد و معبود کے تعلق کی درستی اور تکمیل کے لیے ہے۔ یہ عبد و معبود کے رابطے (ظاہری عبادت) کی استواری کے باوجود اس رابطے کی کسی کمی کی تلافی

[18] البقرة: 153

اور اس تعلق (درست ظاہری عبادت) کو گہرے داخلی یقین سے ہمکنار کر کے تکمیل کی طرف لے جانے والی ہے۔ یہاں اس مقام پر ایمان والوں میں یہ تکمیل محمود و مقصود ہے جس کی شہادت ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ کے الفاظ دے رہے ہیں۔ ﴿إِنَّ﴾ اور ﴿مَعَ﴾ کی داخلی تاکیدی نسبت اور پھر ان میں مذکور پُر یقین شدت اور شدت سے بھرپور یقین پر غور کیجیے نیز ﴿مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾ میں لائیے تو کیا یہ مترشح نہیں ہوتا کہ راکعین کی معیت (مطابقت) میں رہنے کے صریح حکم کے باوجود انسان تو بھول چوک کا شکار ہو کر دائیں بائیں ہو جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نہایت پُر شکوہ تاکیدی اسلوب ﴿إِنَّ﴾ اور ﴿مَعَ﴾ میں صابرین کی معیت و ہمراہی کی انتہائی پختہ یقین دہانی کراتے ہیں کہ جب عبد و معبود کا تعلق (انسان کی طرف سے) تکمیلی صورت اختیار کر گیا تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضرور بالضرور (اکمل) معیت نصیب ہو گی۔

خیال رہے آیت 45 میں صبر وصلاۃ پر مشتمل استعانت کے گراں ہونے کا ذکر ہے اور یہ کہ عاجزین کے لیے یہ بھاری نہیں ہے۔ لیکن آیت 153 کے آغاز ہی میں ایمان والوں کو ایک طرح سے عاجزین ﴿الْخَاشِعِينَ﴾ شمار کر لیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ایمان والے آیت 45 کے مخاطبین سے ایمان میں بہتر معلوم ہوتے ہیں کہ ایمان نے ان کے اندر خشیت (اپنے رب سے ملاقات کا ظن رکھنے کی وجہ سے) قائم کر رکھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہیں صبر و صلاۃ سے استعانت لینے کی تلقین کی گئی ہے تو لازمی بات ہے کہ یہ استعانت جس کے اجزا صبر وصلاۃ ہی ہیں، آیت 45 سے مختلف اور بہتر درجے کی ہے۔ چوں کہ یہ بہتر اور اگلے درجے کی ہے اس لیے آیت کے اختتامی کلمات ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ خشیتِ الٰہی رکھنے والے اہلِ ایمان کی اعلیٰ و برتر استعانت کا پورا پورا لحاظ رکھے ہوئے ہیں۔

اس سے اگلی آیت ﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾[19] ("اور نہ کہو ان کو جو قتل ہوئے اللہ کی راہ میں کہ مردے ہیں بلکہ وہ (ہر دم) زندہ ہیں لیکن تمہیں شعور نہیں") وضاحت کر دیتی ہے کہ ایسے عاجز ایمان والوں کی اپنے رب سے تعلق کی (مزید) درستی و تکمیل (یعنی استعانتِ کاملہ) اور اللہ تعالیٰ کی اکمل معیت کی یقین دہانی کا آخر مقصد کیا ہے:

[19] البقرۃ: 154

اللہ کی راہ میں جان کی بازی لگانے والوں کو موت نہیں آتی، وہ نو بہ نو ایسی حیات کے حامل ہوتے ہیں جس کی حِسّی پہچان (شعور) استعانتِ کاملہ کے حاملین کے لیے بھی اگرچہ ممکن نہیں، لیکن عقل وادراک سے اس کا تصور محال نہیں۔ جان سے گزر جانے والے استعانتِ کاملہ کے حاملین، اللہ تعالیٰ کی معیت (ایک طرح کی حالتِ حضوری) میں اس (نو بہ نو حیات) کا ادراک کرتے ہوئے، اس کے درپے رہتے ہیں۔ حِسّی وجود رکھنے والے ان کے لواحقین بھی استعانتِ کاملہ کی وجہ سے ان (مقتولوں) کو زندہ خیال کرتے ہیں۔ (خیال رہے کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے سے مراد صرف جان سے جانا نہیں بلکہ قتیلِ راہِ خدا ہونا بھی ہے)۔ بہر حال! قتل کی ان دو حالتوں کے لامتناہی (اور غیر حِسّی) ثمر کی تحصیل کی خاطر، عاجز اہلِ ایمان کو استعانتِ کاملہ سے نوازا اور سرفراز کیا گیا ہے۔

اب اپنے مقتولوں کی نو بہ نو حیات کا یقین رکھنے والے ایسے صابرین (قتیلِ راہِ خدا) جو اللہ کی راہ میں خود جان سے نہیں گئے ان کے لیے پیغام ہے کہ عبد و معبود کے تعلق کی درستی و تکمیل (استعانت) کے ابھی اور مراحل باقی ہیں:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾[20]

"اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو تھوڑے سے ڈر سے اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے اور صابرین کو خوش خبری دے دو"

یہ استعانتِ کاملہ کے حامل، اللہ کی معیت میں رہنے والے صابرین کی جماعت ہے جسے مقتولوں کے قتل پر صبر کو درکار استعانت تو پہلے ہی میسر ہے، اب اسے خوش خبری دی جا رہی ہے کہ معبود سے تعلق کی ایک اور بڑھیا جہت پانے کے لیے جس استعانت کی ضرورت ہے اس کو ملزوم آزمائش اسے ضرور دی جائے گی۔ (اس آزمائش کے پانچ پہلو عمومی انداز میں بیان کیے گئے ہیں)۔ چوں کہ یہ صابرین قتیلِ راہِ خدا ہیں اس لیے یہ آزمائش بھی ان کے لیے بجائے خود بشارت کا درجہ رکھتی ہے چہ جائے کہ اس پر صبر کرنے کے انعامات، جو اس پر مستزاد ہیں۔

آیت 155 میں ﴿وَالثَّمَرَاتِ﴾ قابلِ توجہ ہے۔ اس سے مراد (غالباً) پھل فروٹ میوے نہیں۔ کیوں کہ مال اور جان کے نقصان کے بعد اس کا ذکر ہے جس سے نتائجِ اعمال کے، اعمال کے عین مطابق نہ ہونے کا پورا قرینہ موجود ہے۔ البتہ ﴿الثَّمَرَاتِ﴾ کے لفظ کا حِسّی پہلو وضاحت کر رہا ہے کہ نتائجِ اعمال میں نقصان کا تعلق اِس مادی دنیا سے

[20] البقرۃ: 155

ہے۔ اچھے اعمال کے نتائج (بظاہر) نقصان والے ہوں تو اس پر صبر کے لیے استعانتِ کاملہ کی بَڑھیا جہت کی ضرورت پیش آتی ہے، جسے یہ قتیلِ راہِ خدا پالیتے ہیں۔

﴿الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴾[21] ("وہ لوگ کہ جب پہنچے ان کو کچھ مصیبت، تو کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں")

میں بشارت پانے والے ان صابرین کی بنیادی صفت بیان کی گئی ہے:

﴿إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ﴾ کا بیان پچھلی آیت کے ابتدائیہ ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ﴾ کی تشریح کرتا ہے کہ صابرین مصیبت کو نہیں پہنچتے بلکہ مصیبت انہیں آلیتی ہے۔ یعنی مصیبت شامتِ اعمال کا نتیجہ نہیں، بلکہ سراسر آزمائش ہوتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے واقع ہو جاتی ہے تو ہوتی تو آزمائش و امتحان ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ﴾ ہے، لیکن انسانوں (وہ بھی صابرین) کے لیے ایک لحاظ سے مصیبت ہو جاتی ہے ﴿إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ﴾۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوا کہ صابرین بھی بتقضائے بشری آزمائش کو (کسی نہ کسی حد تک) مصیبت کی حیثیت میں لے رہے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کے اسلوب و لفظیات سے بھی یہ عیاں ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش، انسانوں کو (چاہے وہ صابرین ہوں) کسی درجے میں بھی مصیبت محسوس نہ ہو تو وہ آزمائش آزمائش نہیں رہتی۔

آزمائش—مصیبت کی یہ واضح صراحت ﴿وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ﴾ کے مذکورہ معنی کی بھی تنقیح کرتی ہے کہ اس (آزمائش—مصیبت) کی نوعیت کچھ اس طرح کی (بھی) ہو سکتی ہے کہ اعمالِ صالحہ کے متوقع نتائج (فوری) سامنے نہ آئیں۔ آزمائش کی یہ نوع (غالباً) سب سے شدید ہے کیوں کہ اس کے شکار (اللہ کی بے نیازی پر) خود حیران رہ جاتے ہیں اور ان کے مخالفین (متوقع نتائج فوری برآمد نہ ہونے پر ٹھٹھہ کرتے ہوئے) ان کی حیرانی کو پریشانی میں ڈھالنے کا موقع پالیتے ہیں۔ یعنی داخلی اور خارجی، ہر دو اعتبار سے یہ لوگ انتہائی دباو کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسی سخت آزمائش میں صبر کرنے والے فی الحقیقت فنا فی اللہ ہوتے ہیں۔ تبھی تو آیت 154 کے اللہ رب العزت کے بیان ﴿بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ کی مطابقت میں، ان صابرین سے جو کہ ایسی سخت آزمائش کو ملزوم استعانتِ کبریٰ پاکر عبد و معبود کے تعلق کی بَڑھیا جہت سے ہمکنار ہو چکے ہیں، ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ

[21] البقرة: 156

رَاجِعُونَ﴾ کہلوا کر یہ بتایا گیا ہے کہ مقتول تو گزر گئے ان کے لیے تو کوئی آزمائش نہیں رہی، (اس لیے) اُن کے مقام و مرتبہ کی خبر بھی اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں، لیکن یہ جو قتیلِ راہِ خدا ہیں زندہ اور گرفتارانِ مصائب ہیں وہ اپنے مقام و مرتبہ (فنا فی اللہ ہونے کی) خبر ایک اعتبار سے خود دے رہے ہیں حالاں کہ ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ بھی ﴿بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ کے مانند حسیات سے بالاتر (شعور میں نہ آنے والا) تجربہ ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں قتل ہو کر نو بہ نو حیات سے مستفید ہونا بہت بڑا اعزاز ہے لیکن مصائب و نقائص کو کمال صبر سے بخوشی جھیل جانا کچھ کم سعادت کی بات نہیں۔

﴿أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾[22] ("ایسے ہی (صابرین) پر توجہات ہیں اپنے رب کی اور رحمت، اور ایسے ہی ہیں جو ہدایت یاب ہیں")

چوں کہ ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ کے فنا فی اللہ ہونے کا اظہار اور لاشعوری تجربے کا بیان ہے اس لیے ایسے صابرین اپنے رب کی توجہات ﴿صَلَوَاتٌ﴾ کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت کی نظرِ التفات تو اپنی مخلوقات پر رہتی ہی ہے، قرآن مجید میں (غالباً) یہ پہلا مقام ہے جہاں صابرین عبد و معبود کے تعلق کی درستی و تکمیل کی ایسی بلند تر سطح پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان کے رب کی توجہات ان کا استحقاق بن جاتی ہیں۔ ﴿أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ﴾ میں ﴿عَلَيْهِمْ﴾ نہایت لطیف نکتہ بیان کر رہا ہے کہ "اِنہی" پر اِن کے رب سے توجہات ہیں اور رحمت ـــــ "اُنہی" پر نہیں۔ یعنی وہ ایسے صابرین ہیں کہ خود کو اپنے رب کی توجہات اور رحمت کا مستحق ٹھہرا لیتے ہیں۔

اب ذرا ﴿صَلَوَاتٌ﴾ پر غور کیجیے، کیا اس سے مراد ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ کے لاشعوری غیر حِسّی تجربے کے اِنعام میں غیر حِسّی نوازشات نہیں ہیں؟ جیسا کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے، غیر حِسّی اِنعام کے مستحق ہو کر حسیات سے ماورا نو بہ نو زندہ رہتے ہیں ﴿بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ تو قتیلِ راہِ خدا ایسے غیر حِسّی اکرام سے محروم کیوں رہیں جب کہ انہوں نے آزمائش۔مصیبت کے مراحل بخوبی طے کر لیے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ لاشعوری غیر حِسّی تجربے سے گزر کر خود کو اپنے رب کی غیر حِسّی توجہات ﴿صَلَوَاتٌ﴾ کا

---

[22] البقرۃ: 157

مستحق ٹھہرانے والوں کے لیے ﴿وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ کا اَمر باقی نہیں رہتا، کیوں کہ انہیں وہ لاشعوری غیر حِسّی آنکھ مل چکی ہوتی ہے جس سے وہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والوں کی نو بہ نو حیات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ بہر حال! چوں کہ یہ صابرین مادی حِسّی لحاظ سے بقیدِ حیات ہیں لہذا انہیں مادی حِسّی حیات سے متعلق متاع حیات ، یعنی رحمت ﴿وَرَحْمَةٌ﴾ کا بھی مستحق ٹھہرایا گیا ہے۔

آیت 157 کا اختتامیہ ﴿وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾، ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کی مذکورہ معنویت کے تناظر میں) سورت فاتحہ کی دعا ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کا، صبر کے پہلو سے (غالباً) پہلا قرآنی جواب ہے کہ ایسے صابرین ہدایت پائے ہوئے ہیں۔ اس اختتامیے کا ایک لطیف تعلق ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴾[23] ("بولے دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتادے ہم کو کس قسم میں ہے وہ، کیوں کہ اس گائے میں شبہ پڑا ہے ہم کو، اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور ہدایت پالیں گے") کے سیاق سے بھی ہے۔

اِس آیت کے پس منظر کو دیکھیے کہ اُنہیں فقط گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، (اگر اسے کسی طور آزمائش کہا جاسکے) تو یہ انتہائی معمولی آزمائش تھی لیکن اُنہوں نے واضح حکمِ الٰہی تسلیم کرنے کے بجائے تمسخرانہ انداز میں ایسے سوال کیے جن کی حیثیت تحصیلِ حاصل سے بھی کہیں کم تھی۔ جواب دینے کے بعد اُنہیں کہا گیا کہ اب کر بھی گزرو جو تمہیں حکم دیا گیا ہے ﴿فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴾[24]۔ عمل تو کُجا، ان کے پُر تضحیک سوال نہیں رُکے۔ زیرِ نظر آیت 70 کے بعد آیت ﴿قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا﴾[25] میں اپنے بے معنی سوال کا جواب ملنے پر وہ کہتے ہیں ﴿قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ﴾ اب لایا تُو ٹھیک بات، پھر گائے ذبح کرتے ہیں ﴿فَذَبَحُوهَا﴾۔ لیکن آیت 71 کا اختتامیہ ان کے اس طرز کے تعمیلِ حکم کو (تقریباً) عدمِ تعمیل پر ہی محمول کرتا دکھائی دیتا ہے اور وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کر لیں گے ﴿وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ﴾۔ غور کیجیے کہ سورت فاتحہ کے مطابق اللہ رب العزت الرحمٰن الرحیم ہیں، پھر بھی ان کے

---

23 البقرة: 70

24 البقرة: 68

25 البقرة: 71

﴿وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ﴾ کہنے اور جیسے تیسے تعمیلِ حکم کے باوجود بھی نہ صرف یہ واقعہ بلکہ ﴿وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ﴾ انتہائی کاٹ والا بیان قرآن مجید میں باقی رکھتے ہیں۔ اس سے غالباً یہ بتلانا مقصود ہے کہ طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں بہتری کے بغیر محض خوش نما الفاظ کی ادائیگی سے ہدایت یاب نہیں ہوا جاسکتا۔ اور یہ کہ ہدایت خلا میں اچانک وارد نہیں ہوتی بلکہ یہ لازمی طور پر فکر و عمل کے ایک سلسلے سے جڑی ہوتی ہے۔ اس پورے واقعہ (آیت 67 تا 71) میں بنی اسرائیل کا اندازِ تخاطب ملاحظہ کیجیے کہ بے معنی فضول سوالات کر کے حضرت موسیٰؑ سے خدا سے استعانت و دعا کا کہہ رہے ہیں۔ کیا استعانت و دعا ایسی باتوں کے لیے ہوتی ہے؟ کیا وہ لوگ استعانت و دعا کا مذاق نہیں اڑا رہے تھے اسے ہلکا نہیں لے رہے تھے جو کہ عبد و معبود کے تعلق کی درستی و تکمیل کا دوسرا نام ہے۔ پھر پورے واقعہ میں (آیت 61 کے مانند) بہت واضح مغائرت و اجنبیت لیے ہوئے ﴿ادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ کا تکراری بیان ہے۔ پھر یہ کہ ان کے پست سوالات کی پستی ﴿قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَى بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَا سَأَلْتُمْ﴾[26] کے بیان سے اگرچہ واضح ہو چکی تھی پھر بھی وہ خیر کی طرف نہیں بڑھتے اور آخر کار ایک سیدھے سادے حکمِ ربی کو پستیٔ سوالات کی وجہ سے زبردستی کی آزمائش بنا لیتے ہیں، گائے ذبح کرنا انہیں دوبھر ہو جاتا ہے، حالاں کہ آیت ﴿وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ﴾[27] کے مطابق آل فرعون عذاب بن کر ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے اور عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اس میں ان کی بڑی آزمائش تھی۔ کہاں بیٹوں کا ذبح ہونا اور کہاں گائے کا ذبح کرنا۔ جن کے بیٹے ذبح ہوئے ہوں وہ اتنی بڑی آزمائش سے نکالے گئے ہوں، بھلا ان کے لیے ذبیحِ گائے کا حکم آزمائش و امتحان ہو سکتا ہے؟ سوائے یہ کہ کوئی مخصوص طرزِ فکر و عمل انہیں اس ڈھب پر لے آئے۔ یہ درحقیقت پستیٔ فکر اور شامتِ اعمال ہے کہ ایک آسان حکم کی (تقریباً) عدمِ تعمیل اللہ تعالیٰ کی اس قدر ناراضی کا سبب بنی کہ ان کے ﴿وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ﴾ کہنے اور ﴿وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ﴾ انتہائی کاٹ والے بیان کو قرآن مجید میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور پھر ایک اعتبار سے آیت 157 کے اختتامی کلمات میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ ہدایت پائے ہوئے تو وہ ہیں جن پر ان کے رب کی توجہات اور

---

[26] البقرة: 61

[27] البقرة: 49

مہربانیاں ہیں اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب انہیں کوئی مصیبت آلیتی ہے (جو شامتِ اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتی، جس کے پانچ عمومی پہلو بیان بھی کیے گئے ہیں) تو وہ کہتے ہیں اناللہ وانا الیہ راجعون[28]۔

یہاں یہ اشکال نہیں ہونا چاہیے کہ ایک طرف رب کی توجہات و مہربانیاں اور دوسری طرف بے مہری؟ آیت 61 اور 67 تا 71 سے پہلے آیات 40 اور 47 میں بنی اسرائیل کو دی گئی ایسی فضیلت و برتری کا واضح بیان موجود ہے جس کے پیچھے کوئی آزمائش و امتحان نہیں۔ ان کی سیاہ کاریوں کے باوجود آیت 64 میں اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کا ذکر ہے۔ پھر آیت 157 سے پہلے آیت 122 میں ان کو دی گئی نعمتوں اور فضیلت کا ذکر ہے۔ یعنی بنظرِ غائر (توقیفی ترتیب کا لحاظ رکھتے ہوئے) دیکھا جائے تو بغیر کسی آزمائش کے ان کو نعمتوں سے نوازا گیا، حکم عدولی پر بھی بار بار فضل و کرم کیا گیا۔ جب کہ آیت 157 کے مخاطب صابرین تو کڑی آزمائش سے گزر کر صلوت و رحمتہ کے مستحق ہوئے ہیں اور ہدایت یاب ٹھہرے ہیں۔

آیت 150 کے مطابق ہدایت پائے ہوؤں پر پہلے، نعمتوں کا اتمام ہوتا ہے ﴿وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾، آیت 157 میں بھی صابرین کے ہدایت یاب ہونے سے پہلے، ان کے لیے ﴿صَلَوَاتٌ﴾ اور ﴿وَرَحْمَةٌ﴾ کا بیان نعمتوں کے اتمام کا بیان ہے جو ایک اعتبار سے ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ ، ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ جیسے سورت فاتحہ کے دعائیہ کلمات کا جوابی اطلاقی بیان ہے۔ آیت 53 ﴿وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ کے مطابق کتاب و فرقان ہدایت یابی کے لیے ہے، تو کیا ﴿صَلَوَاتٌ﴾ اور ﴿وَرَحْمَةٌ﴾ بھی کتاب و فرقان کے مشابہ اور ہدایت یابی کے لیے نہیں؟

یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بنی اسرائیل کے سوالات کی نوعیت چوں کہ استعانت و دعا کی تحقیر کا پہلو لیے ہوئے تھی اس میں درحقیقت ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کا رَد تھا، اس لیے اس واقعہ کے بیان کے بعد موقع و محل کی مناسبت سے ﴿أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ﴾[29] ("کیا تم بھی چاہتے ہو کہ سوال کرو اپنے رسول سے جیسے سوال ہو چکے

---

28 ﴿الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ البقرة: 156

29 البقرة: 108

موسیٰؑ سے اس سے پہلے، اور جو کوئی کفر لے بدلے ایمان کے، تو وہ بہکا سیدھی راہ سے") میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ (مصیبت گھڑ کر) استعانت و دعا کی تحقیر والے سوالات ایمان کو کفر میں بدل دیتے ہیں، اس لیے ﴿فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ﴾ کے مصداق سیدھی راہ سے بھٹکنے سے بچ بچا کر، عبد و معبود کے تعلق کی درستی و تکمیل کے بعد اللہ کی راہ میں مقتول یا قتیل کا منصب پا کر اور آزمائش۔مصیبت سے گزر کر صلوت و رحمۃ کے مستحقین، ہدایت یاب ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے غور کا مقام ہے کہ ہدایت یاب ہونے کے لیے محض ان شاء اللہ کہہ دینا کافی نہیں، قال کے علاوہ بزبانِ حال اس کا اظہار ضروری ہے۔ جن کا حال عبد و معبود کے تعلق کی درستی و تکمیل کا آئینہ ہو، وہ ان شاء اللہ کی آڑ میں (حکم عدولی کی نیت رکھتے ہوئے) خود ستائی کے انداز میں اپنے ہدایت یاب ہونے کا بیان نہیں داغتے، ان کا عجز ان کا صبر (ان کا حال) ان سے کہلواتا ہے اناللہ و انا الیہ راجعون۔ یہ کتنا بڑا کلمہ ہے اور زبانِ حال سے کہا جائے تو اس کے مطالب و مفاہیم کی پہنائیاں اور وسعتیں کتنی پھیلی ہوئی ہیں، اسے سمجھنے کے لیے سورہ بقرہ کی آیت 28 اور اس کے اختتامی الفاظ پر غور فرمائیں:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾[30] ("کس طرح کافر ہوتے ہو اللہ تعالیٰ سے، حالاں کہ تم بے جان تھے پھر حیات دی تم کو، پھر وہ تمہیں موت دے گا، پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاوگے")

بہر حال! ایک نکتے کی بات یہ ہے کہ صبر کی پہلی جہت آیت 46 ﴿الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ پر جہاں مکمل ہوتی ہے وہاں سے تیسری جہت کی تکمیلی تشکیل شروع ہوتی ہے۔ آیت 46 کے مطابق انہیں اپنے رب سے ملاقات اور اس کی طرف لوٹنے کا ظن ہے، لیکن آیت 156 کے مطابق (چوں کہ وہ پہلے ہی صابر ہیں) اس لیے محض ظن نہیں رکھتے بلکہ زبانِ حال سے کہتے ہیں اناللہ و انا الیہ راجعون۔ اس کے بعد تیسری جہت آیت 157 ﴿أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ کے بیان کی صورت میں اپنی تکمیل کرتی ہے۔ پہلی جہت کے الفاظ ﴿الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِمْ﴾ کا تقابل تیسری جہت کے الفاظ ﴿أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ﴾ سے کیجیے اور غور کیجیے کہ وہاں"

[30] البقرة: 28

اُنہیں اپنے رب سے "ملاقات کا ظن ہے جب کہ یہاں اِن پر "اِن کے رب کی طرف سے "صلوت ورحمۃ ہے، پھر یہ کہ اُنہیں اس کی طرف لوٹنے کا ظن ہے ﴿وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ اور یہاں ان کے رب کی طرف سے ان کی ہدایت یابی کا اعلان ہے ﴿وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾۔ لوٹنا تو سبھی نے ہے، ہدایت پائے ہوئے ہیں کہ نہیں، یہ بات اہم ہے۔ اور یہ بات اللہ رب العزت کی طرف سے ہی طے ہونی ہے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ صبر کی تیسری جہت کئی اعتبار سے پہلی جہت سے برتر ہے۔

## چوتھی جہت

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (١٧٤) أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾[31] "بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں کتاب میں سے جسے اللہ نے نازل کیا ہے، اور لیتے ہیں اس پر تھوڑا سا مول، وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ، اور نہ کلام کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو، اور ان کے لیے ہے عذاب دردناک۔ یہی ہیں جنہوں نے مول لیا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب بدلے مغفرت کے، سو کس قدر صبر کرنے والے ہیں وہ آگ پر"

بے شک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں کتاب میں سے، جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کیا نازل کیا ہے جسے یہ لوگ چھپاتے ہیں؟ اگر کتاب میں سے مراد کتاب کا جز ہے تو ﴿مَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾ زائد معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سوال باقی رہتا ہے کہ ﴿مَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾ سے کیا مراد ہے؟ اگر ن ز ل کے بلندی سے اترائی کے معنی ملحوظ رکھے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کتاب میں سے معانی و مفاہیم کی تنزیل مراد ہے، یعنی کتاب میں سے کچھ یا کتاب جزوی طور پر (بلندی سے اتار کر) ہر انسان کے لیے قابلِ فہم بنا دی جاتی ہے روشنی بکھیر دی جاتی ہے۔ زیرِ نظر آیت 174 سے پہلے سورۃ البقرہ کی آیت 159 (توقیفی اعتبار سے) اس تعبیر کی بنیاد فراہم کرتی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ

[31] البقرة: 174-175

أُولَئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾ غور کیجیے کہ الکتاب میں انسانوں پر واضح کر دیے جانے کے بعد ——— اس وضاحت وہدایت میں سے تنزیل کا بیان ہے (جو الکتاب پر مستزاد لیکن اس میں سے ہے) اسے چھپانے والوں پر اللہ کی اور لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے۔ ﴿مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ﴾ اور ﴿مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى﴾ کا تقابلی مطالعہ کیجیے تو کیا یہ معلوم نہیں ہوتا کہ الکتاب میں لوگوں کے لیے جو کچھ کھول دیا جا چکا ہے (ما بینہ) اس کے بعد وہ لوگ کہ جن پر اس کھولے گئے میں سے ﴿مِنَ الْبَيِّنَاتِ﴾ راہنمایانہ طور پر ﴿وَالْهُدَى﴾ تنزیل کی گئی اور وہ اسے چھپاتے پھریں تو ایسے لوگوں پر اللہ اور لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے۔

اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ آیت 159 تک (توقیفی لحاظ سے) ﴿الْبَيِّنَاتِ﴾ اور ﴿وَالْهُدَى﴾ کیا کیا مفاہیم فراہم کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل گائے والے قصے میں تین بار ﴿يُبَيِّنْ لَنَا﴾ کے الفاظ ادا کرتے ہیں جس کے پیچھے دوسری گائیوں سے فرق کر کے مطلوبہ گائے پہچان لینے کا مدعا پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ب ی ن کے مادہ میں مقابلتاً فرق کر کے حق تک پہنچنے کا معنی موجود ہے ﴿قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ﴾۔ آیت 87 ﴿وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ﴾ کے مطابق حضرت مریمؑ کے بیٹے حضرت عیسیٰؑ کو اور آیت 92 ﴿وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَى بِالْبَيِّنَاتِ﴾ کے مطابق حضرت موسیٰ کو بینات عطا ہوئے۔ ﴿يُبَيِّنْ لَنَا﴾ سے لیا گیا مفہوم دھیان میں رہے تو حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کو عطا کیے گئے بینات "فرق کیا ہوا نتھارا ہوا حق" معلوم ہوتا ہے۔ آیت 99 ﴿وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ﴾ کے مطابق نبی کریم ﷺ پر آیاتِ بینات یعنی آیاتِ فرقان نازل ہوئیں۔ آیت 109 ﴿مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ﴾ سے بھی، فرق کر کے نتھار کے، کھوٹ سے بالکل پاک و واضح حق کا مفہوم سامنے آتا ہے۔ لہٰذا آیت 159 کے ﴿مِنَ الْبَيِّنَاتِ﴾ کے لیے جو مفہوم پچھلی آیات سے تشکیل پاتا ہے وہ فرق کیا ہوا نتھارا ہوا واضح حق ہے۔ تو ﴿مِنَ الْبَيِّنَاتِ﴾ سے مراد ہوا "بالکل واضح نتھارے ہوئے حق میں سے"۔

اب ھدی کو دیکھیے، سورت فاتحہ میں ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا ہے۔ صراطِ مستقیم چلنے والے کو آگے آگے دِکھتا ہے۔ اسی لیے اس پر (بظاہر) آسانی سے چلا جا سکتا ہے۔ منزل تک جانے کے لیے اس پر سنگِ میل بھی نصب ہوتے ہیں۔ لیکن صراطِ مستقیم کا چناو کر کے اس کی طرف گامزن ہونا، چلنے والے پر منحصر ہے۔ وہ چل پڑے تو صراطِ مستقیم بجائے خود کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ اگر رکاوٹیں آئیں تو وہ چلنے والے کا

اپنا مسئلہ ہوتی ہیں۔ اس لیے ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کے الفاظ میں صرطِ مستقیم کی سمت چلنے کی دعا کی گئی ہے تاکہ چلنے والے کے چلاو کی تشکیل ہو۔ اسے صراطِ مستقیم کی طرف چلنے کی صلاحیت و توفیق نصیب ہو۔ پھر سورت بقرہ آیت2﴿ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ﴾ میں آگاہ کر دیا گیا ہے کہ یہ کتاب (قرآن مجید) اسی مسئول صلاحیت و توفیق کے حصول سے عبارت ہے۔ یہ کتاب ایسی صلاحیت و توفیق دینے والی ہے جس سے صراطِ مستقیم کی طرف چلنا ممکن اور سہل ہو جائے گا۔ لیکن یہ چلنے والے کو خود کار انداز میں نہیں چلائے گی، اس میں صلاحیت و توفیق تقوی سے آئے گی۔ اسی طرح آیت 16﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ﴾ میں الکتاب سے مستفاد ھدی کے بدلے میں کوئی اور صلاحیت و توفیق لینے کو غیر نافع تجارت قرار دے کر واضح کر دیا گیا ہے کہ ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کی دعائیہ استدعا کا جواب جب ﴿ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ﴾ کی صورت میں دے دیا گیا تو اس (کتاب) سے مستفاد ﴿هُدًى﴾ کو بیچنے والے ایسی صلاحیت و توفیق کے حامل نہیں ہو سکتے جو انہیں صراطِ مستقیم پر گامزن کر سکے۔ اس سے متصل آیات 17، 18، 19، 20 کا مطالعہ بتاتا ہے کہ الکتاب سے مستفاد ﴿هُدًى﴾ (صلاحیت و توفیق) پانے کے لیے کان زبان اور آنکھ کا استعمال کتنا ضروری ہے، خاص طور پر کان اور آنکھ کا۔ آیت 26 میں مچھر کی مثال دے کر فرمایا گیا ہے ﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا﴾ یعنی یہاں مچھر کی مثال سے ﴿هُدًى﴾ مستفاد ہو رہا ہے۔ (غور کیجیے آیت 2 میں الکتاب سے صراطِ مستقیم کی جانب چلنے کے لیے ﴿هُدًى﴾ صلاحیت و توفیق مل رہی ہے اور یہاں یہی صلاحیت و توفیق مچھر کی ایک مثال سے) آیت38﴿قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا﴾ میں سب کو ھبوط کا حکم دیا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ھبوط صرف آدمؑ اور ان کی زوجہ کا نہ تھا بلکہ اس میں تمام اولادِ آدمؑ شامل ہے، پھر فرمایا ﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ کہ صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے جب جب میری جانب سے صلاحیت و توفیق ملے اور جو اس صلاحیت و توفیق کو واقعی کام میں لائیں تو صراطِ مستقیم پر ہونے کی وجہ سے انہیں (سورت فاتحہ کے آخری بیان کے بموجب مغضوب و ضال ہونے کا) خوف و حزن نہیں ہو گا۔ آیت 70﴿وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ﴾ میں بنی اسرائیل توقع رکھتے ہیں کہ ان میں (لایعنی فضول سوالات کے بعد) حق تک پہنچنے کی صلاحیت و

توفیق آچکی ہے۔ اسی لیے ان کے گائے ذبح کرنے کے بعد بھی ﴿وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ﴾ کے الفاظ میں نکیر کی گئی ہے کہ وہ حقیقت میں ﴿هُدًى﴾ یعنی حق تک پہنچنے کی صلاحیت و توفیق سے بہرہ ور تھے ہی نہیں۔ آیت 97﴿وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ میں نبی کریم ﷺ پر نزولِ کتاب کو مومنین کے حق میں ھدی (صلاحیت وتوفیق) اور بشارت گردانا گیا ہے۔ آیت 120﴿وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ میں فرمایا گیا ہے کہ جب تک یہود و نصاری کے دین کی اتباع نہ کرو گے وہ راضی نہ ہوں گے، پھر فرمایا ﴿قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَى﴾ کہہ دو کہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی صلاحیت و توفیق بے شک وہی ہے جو اللہ کی دی ہوئی ہے (اس لیے بجائے تمہاری اتباع کے اس صلاحیت و توفیق کو کام میں لا کر صراطِ مستقیم پر چلا جا سکتا ہے)، اس کے بعد کے بیان ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾ میں ﴿بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا ہے، آیات 17، 18، 19، 20 کے بیانات جن میں کان زبان اور آنکھ کی اہمیت (صلاحیت و توفیق کے حوالے سے) اجاگر کی گئی ہے، مزید منقح ہو جاتی ہے اور اس بات کی تصریح ہوتی ہے کہ ھدی اور علم باہم مترادف ہیں نیز یہ کہ ان سے مراد ایسی صلاحیت و توفیق ہے جس سے صراطِ مستقیم کی اتباع کی جا سکتی ہے۔

آیت 142﴿يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ کے سیاق سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے، صراطِ مستقیم کی طرف چلنے کی صلاحیت و توفیق سے نوازتا ہے (یعنی کان زبان آنکھ تو سب کے پاس ہیں، لیکن متقی ہی انہیں درست سمت میں استعمال کرنے والے (آیت 2، 3، 4) ہو سکتے ہیں۔ یوں متقی ہونا، رب کی طرف سے عطا کردہ ﴿هُدًى﴾ صلاحیت و توفیق کو خدائی منشا کے مطابق استعمال کرنا ہے)۔ آیت 143﴿وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ﴾ بھی اپنے سیاق تبدیلیٔ قبلہ کے حوالے سے وضاحت کرتی ہے کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم یہ معلوم کرنے کے لیے تھا کہ کون رسول ﷺ کا تابع رہتا ہے اور کون پھرتا ہے، اور بے شک یہ امر اللہ تعالیٰ کی عنایت کی ہوئی صلاحیت و توفیق ﴿هُدَى اللَّهِ﴾ درست سمت میں استعمال کرنے والوں پر بھاری ثابت نہیں ہوا۔ اسی آیت کا گلا حصہ ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾، آیات 2، 3، 4 سے مستفاد معانی (متقیوں / ایمان والوں کے لیے ھدی) کی توثیق کرتا ہے ——— یا آیات 2، 3، 4 اس آیت کے

اخاذ مفہوم کی اساس فراہم کرتی ہیں۔ آیت150﴿وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اتمام، متقین کو صراطِ مستقیم کی جانب چلنے کو درکار صلاحیت و توفیق سے بہرہ ور کر دینا ہے۔ یہ ایک لحاظ سے سورت فاتحہ میں ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کے بعد ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ کے دعائیہ بیان کا جواب بھی ہے۔

لہذا ھدی کے بنیادی معانی صلاحیت و توفیق کے ہوئے جس کا ایک مظہر کان زبان اور آنکھ ہیں۔ اس لیے آیت159 کے بیان ﴿مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى﴾ کا ایک مطلب فرق کیے ہوئے نتھارے ہوئے حق میں سے اللہ کی طرف سے تنزیل اور اللہ ہی کی طرف سے صراطِ مستقیم کی جانب چلنے کے لیے صلاحیت و توفیق کی عطا ہے۔ اب ہم یہ کہنے کی کچھ کچھ پوزیشن میں ہیں کہ زیرِ نظر آیت174 میں ﴿مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ﴾ مراد ﴿مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى﴾ ہے یعنی کتاب میں سے فرق کیے ہوئے نتھارے ہوئے حق میں سے (جو ایک اعتبار سے صراطِ مستقیم ہے) اس کی جانب چلنے کے لیے اس کے مطلوب فہم کے لیے درکار صلاحیت و توفیق کا بھی نزول۔ یہ کتاب کے بعض مقامات کی ایسی تنزیل ہے جسے شرح صدر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سورۃ البقرہ کی درج ذیل آیات بھی (توقیفی اعتبار سے آگے بڑھتی ہوئیں)، مذکورہ لیے گئے مفہوم کی تشکیل کرتی ہیں۔ ﴿وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾[32] ، ﴿فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ﴾[33] ، ﴿وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ﴾[34] ، ﴿وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ﴾[35]

بہر حال! یہ نزول ایسی روشنی ہے جو آسمان سے اترنے والی بارش کی طرح سیر اب کرنے والی ہوتی ہے، اسے چھپانے والے پوری طرح جانتے بوجھتے سمجھتے چھپائیں، تو یہ کتنا بڑا جرم ہے؟ اور چھپائیں بھی تو کیوں؟ تھوڑے سے مول کے لیے۔

---

32 البقرة: 22

33 البقرة: 59

34 البقرة: 102

35 البقرة: 164

اب یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتمان (چھپانے) کے مفاہیم بھی توقیفی لحاظ سے دیکھ لیے جائیں۔ قرآن مجید میں سب سے پہلے (آیت 33) قصہ آدمؑ وابلیس ﴿قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ میں کتمان کا ذکر ملتا ہے۔ قصہ آدمؑ وابلیس کا یہ سب سے پہلا قرآنی مقام بھی ہے جو البقرہ کی آیت 30 سے شروع ہوتا ہے، اس لیے حق تو یہ ہے کہ صحیح قرآنی جانکاری کے لیے آیت 29 تک کا توقیفی مطالعہ کیا جائے۔ لیکن طوالت کے خوف سے فی الحال اسے ملتوی کرتے ہوئے اصل موضوع کے لحاظ سے صرف آیات 30، 31، 32، 33 کا سرسری جائزہ لینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ زمین میں خلیفہ بنانے کی بات کرتے ہیں تو فرشتے اس خلیفہ کے فساد اور خون ریزی برپا کرنے کا ذکر اپنے اس عمل سے کرتے ہیں کہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح اور تیری تقدیس کرتے تو رہتے ہیں۔ آیت 30 ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ میں اس کی تردید کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ پھر آدمؑ کو اسما سکھانے کے بعد فرشتوں کے سامنے اس چیلنج کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے بتاو، جنہیں بتانے سے وہ قاصر رہتے ہیں اور اپنی لاعلمی کا اعتراف ان اختتامی الفاظ (آیت 32) میں کرتے ہیں ﴿إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾۔ جب آدمؑ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فرشتوں کو نام بتادیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں زمین اور آسمانوں کے غیوب کا خوب علم رکھتا ہوں اور جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔ یہاں یہ بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرشتے چھپا کیا رہے تھے؟ غور کیجیے کہ فرشتے اپنی تسبیح و تقدیس کرنے اور خلیفہ فی الارض کے خون ریزی و فساد برپا کرنے کا تقابل کرتے ہیں۔ اس تقابل میں جو بات انہوں نے ظاہر کی وہ تو خلیفہ فی الارض کی خون ریزی اور اپنی تسبیح و تقدیس ہے، لیکن یہ بات چھپا گئے کہ ان کا تسبیح و تقدیس کرتے رہنا کسی انفرادی (نفسی) یا اجتماعی (باہمی) چیلنج کے بغیر ہے، جس کی اپنی اہمیت ہے لیکن نفسی و اجتماعی چیلنجز (جن کا ایک لازمی نتیجہ فساد و خون ریزی کی صورت میں سامنے آتا ہے) کے ہوتے ہوئے تسبیح و تقدیس کا ایک الگ بلند مقام ہے۔ یہ چیلنجز آدمؑ و ارض (خلیفہ فی الارض) دونوں کی خلقت میں رکھے گئے ہیں۔ اس لیے عبد و معبود کے تعلق کی درستی اور تکمیل کے لیے ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کے الفاظ میں پہلی سورت ہی میں (طلبِ استعانت) کا دعائیہ کلام آیا ہے۔ لیکن آسمانوں اور آسمانی مخلوقات میں نفسانی تحدیات اس طرح نہیں ہیں۔ انہیں معبود سے تعلق کی درستی و تکمیل کا مسئلہ درپیش ہی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرشتے امر واقعہ صحیح بیان کرنے

کے ساتھ یہ بات چھپا گئے کہ انہوں نے تسبیح و تقدیس، فساد و خون ریزی کے مقابل جس طرح افضل دکھائی ہے اس طرح ہے نہیں۔ خلافت ایسا اختیار ہے جو (استعانتِ کبری سے) آدمیت اور ارضیت دونوں کے نفسانی چیلنجز پر قابو پا کر نسبتاً برتر تسبیح و تقدیس (شعوری عبادت) کر سکتا ہے۔ فرشتوں پر یہ امور (خلیفہ فی الارض اور فساد و دم جیسے الفاظ سے) مکمل چھپے ہوئے نہیں تھے۔ البتہ خلافت کے اختیارات کی نوعیت (کہ عملاً یہ سب کیسے ہو گا) اس کا انہیں بالکل علم نہیں تھا، جس کا وہ فوراً اعتراف کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ اسما مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو، کا ایک مطلب یہ نظر آتا ہے کہ جس طرح تم نے فساد و دم کے مقابل اپنی تسبیح و تقدیس کی (بین السطور) برتری ظاہر کی ہے اس کا تقاضا ہے کہ مجھے اسما بتاؤ، جو وہ نہیں بتا پاتے۔ اور کہتے ہیں کہ تو علیم و حکیم ہے۔ یعنی جتنا علم کسی کو دیتا ہے اپنی حکمت سے دیتا ہے، اور جتنا علم دیتا ہے اس کے ساتھ حکمت بھی عطا کرتا ہے۔ (اس لیے دیے گئے علم کے ساتھ منسلک حکمت کی بدولت فرشتے مذکورہ بات جانتے تھے)۔ ان آیات میں ﴿أَنْبِئُونِي﴾ اور ﴿أَنْبِئْهُمْ﴾ کے الفاظ بھی قابلِ غور ہیں۔ جسے معلوم نہ ہو، اس کے لیے خبر بھی ایک درجے میں غیب شمار ہوتی ہے۔ فرشتوں کے لیے "اسما" معلوم نہیں تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے معلوم کا مجھ پر ﴿أَنْبِئُونِي﴾ اظہار کرو، اگر تم سچے ہو۔ ان کی لاعلمی کے اعتراف پر آدمؑ کو حکم دیا انہیں اسما سے باخبر کر دو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے تمام غیوب کو مکمل جاننے کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہ جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو میں پوری طرح جانتا ہوں۔ یعنی میں اللہ رب العالمین آسمانوں اور زمین کے تمام غیوب سے مکمل علم میں ہوں پھر بھی تم مجھ سے چھپا رہے تھے حالاں کہ تمہاری اپنی حالت یہ ہے کہ آدم کے علم میں آئے اسما بھی مجھے اس لیے نہیں بتا پائے کہ وہ (آسمانوں و زمین سے کہیں کم درجے کے غیوب ہوتے ہوئے بھی) تمہارے علم میں نہیں تھے ——— لیکن دیکھو آدمؑ کے علم میں تھے۔ اس پورے بیان کو "اگر تم سچے ہو" کو دھیان میں رکھ کر دیکھا جائے تو فرشتوں پر نہایت لطیف چوٹ محسوس کی جا سکتی ہے کہ وہ دیے گئے علم سے (مکمل) حکمت کشید نہیں کر پائے جب تک کہ انہیں متعلقہ مکمل علم (اسما) دے نہیں دیا گیا۔ جب کہ خلیفہ فی الارض نے فساد و دم سے نبرد آزما ہونا ہے اور عبد و معبود کے تعلق کی درستی و تکمیل سے، خود اختیاری سے شعوری طور پر تسبیح و تحمید و تقدیس کی طرف لپکنا ہے۔

اس کے بعد آیت 42 ﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ میں حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ (کنفیوز) کرنے کی ممانعت اور حق کو جانتے بوجھتے چھپانے کے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب خود

ساختہ حق کی قبولیت کا کوئی ڈھونگ کامیاب نہیں ہوتا تو مخالفین، حق کو (جس حد تک ممکن ہو) کنفیوز کرنے کی پالیسی اپنا لیتے ہیں اور وہ حق کو جانتے بوجھتے ہوئے چھپائے چلے جاتے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ تلبیس و کتمان میں مکمل نادانستگی نہیں پائی جاتی۔

اس کے بعد آیت 72 ﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ میں ﴿فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا﴾ کنفیوز کرنے کا بیان ہے۔ اس کنفیوژن کا کہ بنی اسرائیل قتل کو ایک دوسرے پر دھر رہے تھے ،بنیادی مقصد قاتل کو چھپانا تھا۔ بیانِ قتل سے پچھلی آیات میں ان کے لایعنی فضول سوالات، ان کی پھیلائی کنفیوژن (التباس) واضح کرتے ہیں۔

اس کے بعد آیت 140 میں فرمایا ہے کہ کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد یہودی تھے یا نصرانی، کہہ دو کہ تم کو زیادہ علم ہے یا اللہ کو؟ پھر فرمایا اس سے بڑا ظالم کون جس کے پاس اللہ کی طرف سے شہادت ہو اور وہ اسے چھپائے، اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾[36]۔ اللہ کی طرف سے شہادت، ایک لحاظ سے من البینات و ھدی میں سے ہے، نزول من الکتاب سے ہے۔ یہ ایک اعتبار سے شرح صدر ہے جسے جانتے بوجھتے چھپانے والا کافر و ظالم ہی نہیں، سب سے بڑا ظالم ہے۔

آیت 146 میں فرمایا کہ جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس (حق) کو پہچانتے ہیں جیسے پہچانتے ہیں اپنی اولاد کو۔ لیکن ان میں سے بعضے حق کو چھپاتے ہیں اور وہ جانتے ہوتے ہیں ﴿وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾۔ یہاں بھی حق کو پہچاننے میں کسی ابہام کا شکار ہوئے بغیر، جان بوجھ کر اسے چھپانے کا بیان کیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کو (آیت 145 کے مطابق) ظالموں میں شمار کیا گیا ہے۔

کتمان سے متعلق آیات کے توقیفی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتمان میں کسی نہ کسی درجے کی دانستگی ضرور پائی جاتی ہے، البتہ یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ دانستہ کتمان کے پیچھے اصل محرک کیا ہے؟ جہاں محرک بالکل منفی نوعیت کا ہے

[36] البقرة: 140

حق کے مقابل ہے اور نادانستگی کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا، وہاں باقاعدہ جانتے بوجھتے ہوئے (کتمان) چھپانے کا بیان آیا ہے۔

بہر حال! زیرِ نظر آیت (174) میں اس سے آگے ﴿فِي بُطُونِهِمْ﴾ کے بغیر بھی بات بظاہر مکمل معلوم ہوتی ہے، تو اسے لانے کا مقصد کیا ہے؟ غالباً ایک وجہ تو یہ ہے کہ صرف مَا يَأْكُلُونَ إِلَّا النَّارَ سے ظاہر کی طرف توجہ رہنے کا احتمال تھا کہ یہ لوگ اس طرح جو کچھ کھا رہے ہیں وہ آگ ہے اور یوں بیان ایک محاوراتی بیانیہ معلوم ہوتا۔ جب کہ ﴿فِي بُطُونِهِمْ﴾ سے ایک تو شدت ظاہر کرنی مقصود ہے، دوسرا یہ کہ بطن، ظاہری جسم کے مقابلے میں چوں کہ اندرون اور نسبتاً پیچیدہ ہے اس لیے توجہ ایسے لوگوں کی ماوراشعور غیر حِسّی پر داخت کی طرف بھی کرائی گئی ہے۔ اسی طرح ﴿يَأْكُلُونَ﴾ کے بغیر محض (فی **بطونھم** نار) جیسے کسی بیان سے ظاہریت کی کُلّی نفی ہو جاتی، جب کہ ان کے تھوڑا سا مول لینے کے مادی پہلو کو عیاں کرنا بھی ایک مقصد ہے۔ تو آیت کے اس حصے سے جو مفہوم بر آمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بے شک جو لوگ (بُری تحریک سے) چھپاتے ہیں کتاب میں سے، وہ روشنی جسے اللہ تعالیٰ نے رحمت سے اتارا ہے اور اس (چھپانے) پر تھوڑا سا مول لیتے ہیں، وہ مول انہیں مادی منفعت (دنیاوی اعتبار سے) تو دے رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے باطن کی ناری پرداخت بھی کر رہا ہے، اس غیر حِسّی باطن کی جو (اس مول و مادی منفعت کے مقابلے میں) باقی رہنے والا ہے۔ دھیان میں رہے، چوں کہ اتاری گئی یہ روشنی غیر حِسّی ہے اس لیے اس کے اثرات بھی غیر حسی سطح پر زیادہ مرتب ہوتے ہیں۔ اگر اس سے سیرابی کا کام لیا جاتا تو بطن کی نشو و پرداخت نوری ہوتی، لیکن اسے چھپانے کی وجہ سے بطن سراپا نار ہو جاتا ہے۔ اس لیے اتاری گئی روشنئ کتاب کا کتمان، اصلاً ان کے بطن کی ناری پرداخت "ہی" کر رہا ہے، باقی وہ جو کچھ کھا" بھی" رہے ہیں فوائد سمیٹ رہے ہیں ان کی تو کوئی وقعت ہی نہیں۔

زیرِ نظر آیت (174) کے اگلے حصے "اور اللہ اُن سے قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا اور نہ اِن کو پاک کرے گا اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے" کو آیت 159 کے بیانِ کتمان سے تقابل میں دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اللہ اور لعنت کرنے والوں کی لعنت کے سخت بیان کے بعد توبہ کی بھرپور گنجائش (آیت 160 کے مطابق) اس شرط کے ساتھ باقی رکھی گئی ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرتے ہوئے بجائے کتمان کے کھول کر رکھ دیں ﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا﴾۔ لیکن زیرِ نظر آیت (174) میں ایسی کوئی گنجائش موجود نہیں۔ دونوں مقامات پر کتمان کی

یکسانیت کے باوجود اتنا واضح فرق (غالباً) اس لیے رکھا گیا ہے کہ آیت 174 کے مطابق کتمان کے مرتکب اس پر تھوڑا سا مول لیتے ہیں ﴿وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ جب کہ آیت 159 میں ایسے بیان کی عدم موجودگی اشارہ کرتی ہے کہ ان کے کتمان کا محرک حق کے بالکل مقابل نہیں۔ وہ محرک وہ تحریک ہے تو قابلِ مذمت، لیکن وہ جیسی بھی ہے قابلِ اصلاح ہے کہ اس میں کچھ کچھ نادانستگی پائی جاتی ہے۔ اس لیے انتہائی سخت تنبیہ کے بعد توبہ و اصلاح کی مشروط گنجائش (آیت 160 میں) باقی رکھی گئی ہے۔

لیکن اس سے آگے (آیات 161، 162 میں) زیرِ نظر آیت 174 سے مماثل (ان کی موت کے بعد کا) بیان ملتا ہے کہ "بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور کافر ہی مر گئے، انہی پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے، اسی لعنت میں ہمیشہ رہیں گے، ان پر سے عذاب ہلکا نہ ہو گا اور ان پر نگاہ بھی نہ کی جائے گی"۔ یعنی مشروط گنجائش سے فائدہ نہ اٹھانے کی صورت میں ان کی حالت بھی (ایک لحاظ سے) تھوڑا سا مول لینے والوں کے برابر ہو جاتی ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ کتمان کا ارتکاب کر کے اس پر تھوڑا سا مول لینے والے کافر ہوتے ہیں۔ لیکن آیت 161 ہر دو مقامات کے ان کافروں کے لیے ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ کے الفاظ میں ایک آخری گنجائش دیتی نظر آتی ہے کہ مرنے سے پہلے پہلے وہ کتمان سے تائب ہو جائیں تو اس انجام سے بچ رہیں گے جس کا ذکر آیت 162 اور آیت 174 میں کیا گیا ہے۔

چوتھی جہت کی ایک قابلِ غور بات ہے کہ یہاں لاشعوری غیر حِسّی بطن کی پرداخت و نشوونما ہو تو ہو رہی ہے، لیکن تیسری جہت کے صابرین سے بالکل متضاد رُخ پر۔ کتاب چھپانے کا محرک تھوڑا سا مول ہے جس کی حِسّی و مادی ترغیب پر ایسے لوگ لپک لپک جاتے ہیں۔ ان پر کوئی آزمائش۔ مصیبت نہیں ہے، جس پر صبر کرنا دشوار ہو، بلکہ تھوڑی سی دنیاوی منفعت کا لالچ ہے۔ اس مول و منفعت سے یہ لوگ بچ نہیں پاتے اور بے صبرے ہو کر کتاب میں سے جو ان پر بالکل واضح ہو چکا ہے جس کی حیثیت ان پر اللہ کی طرف سے شہادت کی ہے جو فرق کیا ہوا نتھرا ہوا حق ہے، اسے چھپانے کا بہت بڑا جرم کر بیٹھتے ہیں۔

زیرِ نظر آیت (174) کے اگلے حصے "اور اللہ اُن سے قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا اور نہ اِن کو پاک کرے گا اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے" کو تیسری جہت کی اختتامی آیت 157 (ایسے ہی لوگوں پر اپنے رب کی توجہات و رحمت ہے اور وہی ہدایت پائے ہوئے ہیں) کے تقابل میں دیکھیے کہ دونوں مقامات پر عبد کی طرف سے نہیں بلکہ معبود کی طرف سے وہ بیان ہے جس کا مستحق عبد اپنے آپ کو ٹھہراتے ہیں۔ ایک مقام پر رب کی توجہات و رحمت کا بیان ہے اور دوسرے مقام پر (رب کے نہیں) اللہ کے کلام نہ کرنے اور پاک نہ کرنے کا ذکر ہے، ایک مقام پر ان کی ہدایت یابی کی خوش خبری ہے اور دوسرے مقام پر دردناک عذاب کا واشگاف اعلان۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

تھوڑے سے (مادی) مول پر مر مٹنے والے کتمانِ کتاب کے عظیم جرم کا ارتکاب کرنے والے (تھوڑے سے مول کے مقابلے میں کہیں زیادہ) اپنے غیر مادی غیر حسّی پہلو کو سراسر آگ بنا لیتے ہیں، اس کی وجہ اصلاً مول نہیں بلکہ کتمانِ کتاب کا انتہائی سنگین جرم ہے اسی لیے مول (ظاہراً) جتنا بھی زیادہ ہو، حقیقت میں بہت ہی قلیل ہے۔ دیکھا جائے تو بطن کا سراپا آگ ہونا ﴿فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ﴾ کتمانِ کتاب کی سنگینئ جرم کے لحاظ سے ہے نہ کہ مول کی مقدار کے۔ (خیال رہے کتمانِ کتاب سے یہاں مراد، کتاب میں سے ان پر مکمل واضح کی گئی شہادت ہے غیر مشتبہ روشنی ہے)

آیت 162 کا بیان ﴿لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ﴾ آیت 174 کے بیان ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ﴾ کی اساس فراہم کرتا ہے۔ عذاب کے ہلکا نہ ہونے کا مطلب روزِ قیامت ان سے اللہ کا کلام نہ کرنا ہے اور جب انہیں دھیان ہی میں رکھا نہ جائے گا تو تزکیے کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔

اس سے اگلی آیت 175 ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ یہی ہیں جنہوں نے ھدی کے بدلے گمراہی (ضال) اور مغفرت کے بدلے عذاب مول لیا، سو کس قدر صبر کرنے والے ہیں وہ آگ پر" کے مطابق کتمان کرنے والے درحقیقت صراطِ مستقیم کی طرف چلنے کو درکار صلاحیت و توفیق (ھدی) کو (جس سے ان پر روشنی و شہادت واضح ہو چکی ہوتی ہے)، تھوڑے سے مول (کی گمراہی) کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں نیز مغفرت کے بجائے عذاب مول لیتے ہیں (حالاں کہ آیت 161 کے مطابق موت سے پہلے پہلے انہیں کتمان سے تائب ہونے کا موقع دیا جاتا ہے)۔ بہر حال! اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کتمانِ کتاب کے مرتکب اصلاً (کسی نہ کسی نوعیت کے) تھوڑے سے مول پر بے صبرے ہوتے ہیں یعنی کتمان کا محرک کوئی فوری مادی حسی فائدہ ہوتا ہے۔ ایسے بے صبرے صبر کرتے بھی ہیں تو کس پر؟ اپنے باطن کو اپنے ابدی غیر حسی پہلو کو، سراپا آگ بنانے پر۔ ان کی بے صبری بے قناعتی صاف صاف آگاہ کرتی ہے کہ عبد و معبود کے تعلق ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کی تکمیل تو دُور کی بات، وہ درست نہج پر ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ﴿فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ کا بیان بتاتا ہے کہ تھوڑے سے مول کے لیے کتمانِ کتاب کا ارتکاب کرنے والے، نگہِ التفات کے غیر مستحق غیر مزکّی لوگ ﴿وَلَا يُزَكِّيهِمْ﴾، سراپا آگ بننے کو، عبد و معبود کے تعلق کا عین ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ خیال کر رہے ہوتے ہیں۔

صبر کی دوسری جہت (آیت 61) میں مذکور بنی اسرائیل کی بے صبری ﴿يَامُوسَى لَنْ نَصْبِرَ عَلَى طَعَامٍ وَاحِدٍ﴾ کا ایک جواب ﴿فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ کا یہ بیان بھی معلوم ہوتا ہے۔

صبر کی پہلی جہت آیت 44 (کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو اور بھولتے ہو اپنے آپ کو اور تم تو پڑھتے ہو کتاب، پھر کیوں نہیں سوچتے) کو چوتھی جہت کی آیت 174 سے تقابل میں دیکھیے کہ ایک جگہ تلاوتِ کتاب کے باوجود بھول چوک کا ذکر ہے اور دوسری جگہ بھول چوک کے بجائے (دانستہ) کتمانِ کتاب اور اس پر تھوڑا سا مول لینے کا بیان ہے۔ اس لیے ایک جگہ (آیت 45، 46) میں طلبِ استعانت کی تلقین ہے جب کہ دوسری جگہ استعانت کے بجائے انتہائی سخت گرفت والا بیان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آیت 174 کے مطابق تلاوتِ کتاب کے حوالے سے کوئی (نسیان وغیرہ کا) مسئلہ نہیں، کتاب کو سمجھا تو ٹھیک جا رہا ہے، لیکن جانتے بوجھتے کتاب (اور اس کے فہم و شہادت) کو تھوڑے سے مول کے لیے چھپایا جا رہا ہے۔

چوتھی جہت کے سلسلے میں اب آیت 176 ﴿ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ﴾ کو دیکھتے ہیں جس میں وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو پوری کتاب حق سے نازل کی ہے (پھر اس میں سے بعض پہلوؤں کا شرح صدر بھی کرا دیا ہے تاکہ شہادت قائم ہو سکے جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا)، اس کے باوجود جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف ڈالا، وہ بے شک ضد میں اَن بَن میں دُور جا پڑے۔ اب تک کا مطالعہ پیشِ نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف فی الکتاب، من البینات والھدی کے مقابل وارد ہوا ہے۔ ایسی بات جسے فرق کر کے نتھار کے، ابہامات سے منزہ کر دیا گیا ہو، اور اس سے متعلق صلاحیت و توفیق بھی عطا کی جا چکی ہو، پھر اس میں اختلاف کا کیا مطلب؟ سوائے یہ کہ ضرور بالضرور دُور از کار ایسی نکتہ طرازی کی جائے جس کا محرک بدنیتی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ من البینات والھدی (سورج کی طرح روشن شہادت) سے جب کتاب کے بعض پہلو بہت واضح ہو جائیں پھر اس کے بعد پوری کتاب کا اسی طرح واضح و منکشف ہونا زیادہ دُور کی بات نہیں رہتی، کیوں کہ اصلاً پوری کتاب ہی حق ہے۔ جس پر شہادت قائم ہو چکی ہو، اس کا پوری کتاب کو بطور حق لینا لازمی امر ہے۔ یوں سمجھیے کہ اگر کسی شخص کو قرآن مجید کی بعض آیات اس طرح سمجھ آ جائیں جیسے اس پر نازل ہو رہی ہوں (یعنی اس پر شہادت قائم ہو جائے) تو پھر وہ ضرور بالضرور پوری کتاب کو اسی طرح سمجھنے کی کوشش کرے گا نہ کہ کتاب میں اختلاف ڈالنے کی۔ زیرِ نظر آیت 176 میں حق اور شق ایک دوسرے کے مقابل آئے ہیں، انہیں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ توقیفی اعتبار سے "حق" سب سے پہلے البقرہ کی آیت 26 میں آیا ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ﴾ بے شک اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی بڑھی ہوئی کسی چیز کی مثال دے، سو جو لوگ ایمان والے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یقیناً یہ (مثال) ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔۔۔۔۔ قابلِ غور بات

ہے کہ قرآن مجید میں "حق" اس سب سے پہلے مقام میں ﴿رَبِّهِمْ﴾ کے ساتھ آیا ہے۔ سورت فاتحہ کا بیان رب العالمین دھیان میں رہے کہ رب کی ربوبیت سے عالمین قائم ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حق کا گہرا تعلق ربوبیت اور عالمین سے ہے۔ مچھر یا اس سے بھی کوئی کم تر چیز عالمین میں سے ہے اور رب کی ربوبیت کے طفیل عالمین سے موافق اور موزوں بھی ہے۔ تو حق کا ایک غالب پہلو یہ ہوا کہ رب کی ربوبیت عالمین کے مختلف مظاہر میں توافق و مطابقت پیدا کر کے ایک نظامِ تناسبات قائم کرتی ہے۔ حق کو پہچاننا در حقیقت اسی توافق و مطابقت اور نظامِ تناسبات کو پہچاننا ہے۔ عالمین میں مچھر، یا اس سے بھی کم تر چیز (چھوٹے سے چھوٹے وائرس) کا ایک اپنا (موزوں) مقام ہے، اس مقام کی دریافت کر لی جائے تو حق حکمت سمیت منکشف ہو جاتا ہے۔ حق کی کلیت، اس کے توافق و موافق اور موزوں پہلو نیز ان سے قائم نظامِ تناسبات کو مکمل گرفت میں لینا شاید انسانی اختیار میں نہیں ہے۔ اس لیے حق و حکمت کا جزوی انکشاف، شرح صدر کی حیثیت رکھتا ہے شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا جو سائنس دان باری تعالیٰ کی مخلوقات میں ربوبیت سے آئی موزونیت و موافقت دیکھ لیتا ہے پہچان لیتا ہے، اس پر اللہ رب العزت کی طرف سے شہادت قائم ہو جاتی ہے۔

توفیقی اعتبار سے حق کا دوسرا بیان البقرہ آیت 42 میں آیا ہے:

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ حق جہاں ہے جتنا ہے موزوں و موافق ہے۔ اس کے پُر حکمت تناسب کو گھٹاؤ بڑھاؤ نہیں، اس میں غیر موزوں (باطل) کی آمیزش نہ کرو۔ اور تم حق کی سمٹری اور موزونیت چھپاتے رہتے ہو، اس کی حکمت پر پردے ڈالتے رہتے ہو، اور تم یہ بات خوب جانتے ہو۔ اَن جانے میں نادانستگی میں اس سمٹری کو کچھ ڈسٹرب کر ڈالو تو الگ بات ہے۔

اس کے بعد آیت 61 میں ﴿وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ اور نظامِ تناسبات کا لحاظ کیے بغیر غیر موزوں طور پر انبیا کو قتل کرتے تھے۔ آیت 71 میں ﴿قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ﴾ بولے اب لایا تو موافق و موزوں بات۔ آیت 91 میں جب یہود یہ کہتے ہیں کہ جو ہم پر اترا ہے اس پر تو ہم ایمان لاتے ہیں اس کے علاوہ نہیں، تو ان سے کہا جاتا ہے ﴿وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ﴾ کہ جس کا وہ انکار کر رہے ہیں وہ تو بہت موزوں ہے اس لحاظ سے کہ جو ان کے پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔ یعنی قرآن مجید، تورات سے موافق و موزوں ہے۔ آیت 109 کے مطابق اہلِ کتاب میں سے اکثر لوگ چاہتے ہیں کہ وہ تمہیں تمہارے ایمان کے بعد کافر بنا دیں اپنے دلوں میں حسد کی وجہ سے، اس کے بعد کہ ﴿مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ﴾ توافق و موزونیت ﴿الْحَقُّ﴾ ان پر مقابلتاً فرق کر کے نتھر کے (تبین) پوری طرح واضح ہو چکا۔ قابلِ غور ہے کہ اہلِ کتاب "دلی حسد" کی وجہ سے ایمان والوں کو کفر پر لوٹانا چاہتے ہیں، یہ حسد ہے ہی اس لیے کہ خود ان پر ایمان (حق) کی موزونیت، اس کی پوری سمٹری پوری

طرح نتھر کر واضح ہو چکی ہے، ان پر شہادت قائم ہو چکی ہے۔ اس شہادت کے بغیر ان کے دلی حسد کی وجہ ایمان والوں کا ایمان نہیں ہو سکتا تھا۔ آیت 119 کا بیان ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ کہ ہم نے آپ ﷺ کو نہایت موزونیت سے بھیجا ہے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا ——— اپنے سیاق کا بھرپور جواب ہے کہ تم لوگ یا تم سے پہلوں کے اس طرح کے سوالات کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی آیت کیوں نہیں آتی ——— کیوں کہ تم اور تم سے پہلے غیر موزوں (بغیر الحق) ہو۔ تم اور تم سے پہلے والے، نظامِ تناسبات میں (رب کی ربوبیت کے مظاہر میں) ایسے کردار کے لیے فٹ نہیں بیٹھتے۔ آیت 121 ﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولَئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ میں بتایا گیا ہے کہ جنہیں کتاب دی گئی وہ اسے اس طرح تلاوت کرتے ہیں پڑھتے ہیں سمجھتے ہیں جیسے اس کا پڑھنا سمجھنا تلاوت کرنا موزوں اور موافق ہے۔ یعنی موزونیت و توافق کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے کتاب کو پڑھتے سمجھتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا اس نظامِ تناسبات سے ایمان (کا رشتہ) قائم ہے اور جو لوگ تلاوتِ کتاب کے دوران میں موزونیت کا لحاظ نہیں رکھتے وہ خسارے والے لوگ ہیں۔ غالباً اس آیت میں "کفر" موزونیت و توافق سے قائم نظامِ تناسبات میں التباس و کتمان کے لیے آیا ہے۔ آیت 144 میں تحویلِ قبلہ کے حکم کے بعد بیان ہے ﴿وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ کہ جن کو کتاب دی گئی ہے وہ ضرور جانتے ہیں کہ ان کے رب کی طرف سے تحویلِ قبلہ کا یہ حکم نہایت موزوں (الحق) ہے۔ یعنی نظامِ تناسبات کے (کل سے) یہ جزو پوری طرح موافق ہے۔ آیت 146 میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ کتاب تحویلِ قبلہ کی موزونیت کو اس طرح جانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو۔ لیکن ان میں ﴿وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ اس حکم کی موزونیت و توافق کو جان بوجھ کو چھپانے والے بھی ہیں (جیسا کہ آیت 121 میں موزونیت و توافق سے قائم پورے نظامِ تناسبات میں کتمان و التباس (کفر) کا ذکر ہوا، لیکن یہاں ایک حکم کی موزونیت اور اس کے کتمان کا بیان ہے)۔ آیت 147 ﴿الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ﴾ کہ موزوں ہی ہے جو تیرے رب کی ربوبیت سے ہے، اس لیے شک لانے والوں میں (شمار) نہ ہونا۔ آیت 149 میں تحویلِ قبلہ کے حکم کی تکرار کے ساتھ یہ بیان آیا ہے ﴿وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ﴾ کہ تیرے رب کی ربوبیت کے پورے نظامِ تناسبات سے، بے شک یہ حکم ضرور بالضرور نہایت موزوں و موافق ہے۔

آیت 176 تک اس سرسری توقیفی مطالعہ سے معلوم ہوا کہ "حق" باہم موزوں امور کی کثرت پر قائم ایک (وحدتی) نظامِ تناسبات ہے، جس میں ہر ہر امر نظامِ تناسبات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور ساتھ ہی اپنے اپنے مقام پر بھی نہایت موزوں ہے۔

جہاں تک شق کا تعلق ہے، توقیفی لحاظ سے (آیت 176 سے پہلے) دو مقامات پر آیا ہے۔ سب سے پہلے گائے والے قصے میں (جہاں قاتل کا پتا لگانا مقصود تھا) بنی اسرائیل کے لایعنی فضول سوالات کے بعد کی (ظاہری) اطاعت کے بعد، جس پر قرآن کا بیان ہے ﴿فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ﴾[37] کہ لگتا نہیں تھا وہ ذبح کریں گے۔ ظاہری اطاعت کے بعد بھی قرآن کا یہ سخت بیان واضح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل میں کج بحثی کتنی راسخ اور پختہ ہو چکی تھی، اس لیے مقتول کے زندہ ہونے کی (حِسّی) نشانی دیکھ کر بھی ان کے رویے میں کوئی جوہری تبدیلی رونما نہیں ہوئی، بلکہ آیت 74 کے مطابق ان کے دل سخت ہو گئے پتھر جیسے، پتھر سے بھی زیادہ سخت۔ کیوں کہ پتھروں میں سے بعضوں سے نہریں جاری ہوتی ہیں ﴿يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ﴾ اور بعضے جب پھٹ جاتے ہیں تو ان میں سے پانی نکلتا ہے ﴿يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ﴾ اور ان میں بعض اللہ کے ڈر سے گر جاتے ہیں ﴿يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ اس پہلے مقام پر فجر اور شق کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ فجر کی صورت میں جو چیز بھی نکلے وہ کثرت وانبوہ میں ہوتی ہے جب کہ شق کا معاملہ اس سے جدا ہے۔ بنی اسرائیل کے اس قصے سے شق کے جو معنی برآمد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ پتھر بھی پھٹ جائے تو اس میں سے پانی نکل آتا ہے (دھارانہ سہی) لیکن ان کے دل اس قدر سخت ہو گئے ہیں کہ مقتول کے زندہ ہونے کی حِسّی نشانی دیکھ کر بھی نہیں پسیجے، پھٹ کر خشیت اللہ کا قطرہ برآمد ہونا تو دور کی بات ہے۔ البقرہ میں دوسرے مقام پر شق کا بیان آیت 137 میں آیا ہے جس کا سیاق یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اسلام کی مخالفت میں ابراہیمی اساس سے ہٹ گئے ہیں انہیں باور کرایا جاتا ہے کہ اسلام کے پیروکار ابراہیمی اساس پر قائم ہیں اس لیے انبیا میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ آیت 137 میں مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ تمہاری طرح ابراہیمی اساس پر قائم ہوتے ہوئے انبیا میں کوئی تفریق نہ کریں تو وہ بھی عطا کی گئی صلاحیت و توفیق کا درست استعمال کرنے والے ہوں گے۔ اور اگر وہ پھریں، روگردانی کریں تو یقیناً بہت زیادہ یک رُخے ہونے کی وجہ سے ﴿فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ﴾ ابراہیمی اساس کی موزونیت و تناسب (حق) کا کسی طور لحاظ نہ رکھ پائیں گے۔

لہٰذا آیت 176 کے بیان ﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ﴾ کا ایک مطلب اپنے سیاق (آیات 174، 175) میں یہ ہوا کہ کتاب میں سے جن امور کے متعلق شرح صدر کرا دی گئی ہے اسے جان بوجھ کر چھپانے والے تھوڑے سے مول کے لیے اپنے کو سراپا نار بنانے پر کس قدر صبر کیے ہوئے ہیں خود کو صحیح سمجھے ہوئے ہیں، حالاں کہ جو کتاب اللہ تعالیٰ نے نہایت موزونیت و موافقت پر قائم نظامِ تناسبات (حق) سے واضح کی ہے اور پھر اس نظامِ تناسبات کی بعض جہات کی موزونیت کی شہادت بھی

[37] البقرة: 71

قائم کر دی ہے (جس سے پورے نظامِ تناسبات کی تفہیم کی راہ کھلتی ہے) اس کے بعد اس میں اختلاف کرنے والے (موزونیت و موافقت و مطابقت کو نظر انداز کرنے والے)، ضرور بالضرور بہت ہی زیادہ یک رُخے اور انتہائی متعصب ہیں جبھی تو انتہائی موزوں و موافق کتاب میں اختلاف ڈالتے ہیں۔

قرآن مجید کے مطابق حق نام ہے موافقت و مطابقت کا موزونیت کا، اور شِق نام ہے ایک ہی جانب نظر کیے رکھنا، ہٹ دھرمی کرنا، یہ خیال کیے بغیر کہ یہ اندازِ نظر، باقی نظامِ تناسبات سے موافق بھی ہے یا نہیں؟ جس پر شہادت قائم ہوتی ہے اس پر موافقت و مطابقت منکشف ہوتی ہے، اس لیے وہ اسی انکشاف کے پھیلاو کو پوری کتاب میں دیکھتا ہے۔ ایسا شخص اختلاف فی الکتاب کا سزاوار نہیں ہو سکتا۔ اب اس شخص کو دیکھیے جس پر شہادت قائم ہو چکی ہے مطابقت و موافقت سے وہ آشنا ہو چکا ہے لیکن پھر اسی رَو میں آگے بڑھنے کے بجائے وہ بالکل معکوس راہ اپناتا ہے، انتہائی واضح مطابقت کے ہوتے ہوئے وہ (کوئی مول لے کر) دُور از کار یک رُخے نکات نکال نکال کر عدم مطابقت اور اَن بَن کو فروغ دیتا ہے، کتاب میں اختلاف ڈالتا ہے۔ ایسا شخص تھوڑے سے مول کے لیے اپنا باطن سراپا نار بنالیتا ہے، کتنی عجیب بات ہے کہ اپنے پر شہادت قائم ہو چکنے کے بعد، وہ کس طرف چلتا ہے، صلاحیت و توفیق ملنے کے بعد ان کا کیسا استعمال کرتا ہے اور پھر مرنے تک اس روش پر قائم رہتا ہے ﴿فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾[38]۔

[38] البقرة: 175